R.G.G.L. NO.7243
Phone 80680

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1981

یومِ اقبال پر خطاب

اسلامی نظام یہ ہے کہ
”دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو“

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیرممالک -/۸۰ روپے (رجسٹرڈ بحری ڈاک)	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ - لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۴	جون ۱۹۸۱ء	شمارہ ۶

فہرست

۱- تیری آواز مکے اور مدینے! - - - (صدر مملکتِ پاکستان کی خدمت میں) - - - ۲

۲- لمعات - - - (اُمت میں ایک سیاسی پارٹی بھی قرآن کے خلاف ہے) - - - ۴

۳- احترامِ آدمیت - - - (دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو!) - - - ۹

بزمِ اقبالؒ جشن ۱۹۸۱ء کی تقریب پر - - - پرویز صاحب کا خصوصی خطاب

۴- بات آگے کیوں نہیں بڑھتی؟ - - - ۳۷

۵- حقائق و عبر - - - (۱) (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) - (۲) ہماری صحافت! - - - ۴۱

(۳) قرآنِ مجید اور ہمارے علمائے کرام! (۴) رجم کا حکم اور مفتی محمد شفیعؒ (مرحوم)

(۵) مفتی صاحبؒ اور حق! (۶) اقبالؒ اور مولوی صاحبان - (۷) مغرب میں اسلام کا فروغ

۶- ڈبل کے بجائے؟ - - - ۵۴

۷- آہ! بیچارہ "دو قومی نظریہ"! - - - (پرویز صاحب) - - - ۵۵

۸- فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی - - - ۷۱

۹- قرآنی درس کے اعلانات - - - ۷۲

ایڈیٹر: محمد خلیل - ناشر: شیخ عبدالحمید - مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس - ۹ ایبک روڈ - لاہور

تری آواز مکّے اور مدینے!

(صدرِ مملکتِ پاکستان کی خدمت میں)

روزنامہ پاکستان ٹائمز (لاہور) کی ۵ مئی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع شدہ ذیل کی خبر، وجہِ فروغِ دیدہ اور باعثِ شادابیٔ قلب ہوئی کہ صدرِ مملکتِ پاکستان نے پشاور میں ایک تقریر کے دوران فرمایا کہ

"کوئی آئین، قرآن سے بہتر اور عظیم تر ہو سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی جمہوریت اسلام سے اعلیٰ۔ میری کوشش یہی ہے کہ میں قوم کو اسی راستے پر لے چلوں۔"

اُمّت کی ہزار سالہ تاریخ میں بالعموم اور پاکستان کی تیس سالہ زندگی میں بالخصوص، یہ پہلا موقعہ ہے جو کسی سربراہِ مملکت کی طرف سے یہ آواز بلند ہوئی ہو کہ قرآنِ مجید سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ آئین (کانسٹی ٹیوشن) ہے ہم صدرِ مملکتِ پاکستان کو اس اعلان پر مستحق مبارک باد قرار دیتے ہیں۔

۲۔ لیکن جیسا کہ صدرِ محترم کو علم ہوگا، قرآنِ کریم کی رُو سے کسی صداقت کا محض اعتراف اور اعلان کافی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ اس کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر، وہ اعتراف اور اعلان کچھ معنی نہیں رکھتا۔ قرآنِ مجید میں ہر مقام پر ایمان اور اعمالِ صالحہ کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ کسی مملکت کا آئین، وہ حدود متعین کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے، وہ مملکت اپنے اختیارات کا استعمال کرتی ہے۔ اُمّتِ مسلمہ یا اسلامی مملکت کے لئے یہ حدود، قرآنِ مجید متعین کرتا ہے۔ اس اعتبار سے، یہ کتابِ خداوندی، اسلامی مملکت کے لئے اصولی آئین کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کے آئین بننے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک پارلیمان وجود میں آئے۔ اس میں آئین سازی کے مسئلہ پر بحث و تمحیص ہو، پھر آراء شماری ہو اور اکثریت کی رائے سے اسے آئین تسلیم، اور سربراہِ مملکت کی توثیق سے اسے نافذ کیا جائے۔ قرآنی آئین کی جزئیات بے شک اسی طرح اُمّت کے مشورے سے طے ہوں گی، لیکن اس کا یہ اصول کہ یہ، مملکت کے لئے استعمالِ اختیارات کی حدود کا تعین کرتا ہے، ان رسمیات کا محتاج نہیں۔ اُمّتِ مسلمہ کا قرآن پر ایمان، اس کے ایسا ہونے کے لئے کافی ہے۔ مملکتِ پاکستان، اسلامی ہونے کی مدعی ہے، اس لئے اس کی حدود بندی کے لئے، قرآنِ مجید آج بھی اس کا آئین ہے۔ اور ہمیشہ اس کا آئین رہے گا۔

۴۔ آپ نے اس آئین کے اعلیٰ تر اور عظیم تر ہونے کا اعلان کیا ہے تو اس سے آپ پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ آپ کی حکومت نے جو کچھ گذشتہ چار سال میں کیا ہے، قرآنی حدود کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے۔ اور جو کچھ ان کے خلاف ہو، اسے بلا تاخیر کالعدم قرار دیا جائے۔ ایسا کرنے کا اقتدار اور اختیار آپ کے پاس موجود ہے، اس لئے اس میں تاخیر یا التوا کے لئے کوئی وجہ، جواز نہیں ہو سکتی۔ اختیارات کی موجودگی میں،

خلافِ قرآن اقدامات کو جس قدر طول دیا جائے گا اسی قدر اس معصیت کی شدت بارگاہِ خداوندی میں بڑھتی جائیگی۔

۵۔ اس تطہیر اور تشکیلِ نو کا آغاز کہاں سے ہونا چاہیئے، اس کی وضاحت آپ نے اپنی تقریر میں خود ہی فرما دی ہے، جب کہا ہے کہ

> اسلامی طرزِ حکومت میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اسلام میں اقتدارِ حکومت وراثتاً منتقل نہیں ہوتا۔ اس میں صرف انہی لوگوں کو اختیارات استعمال کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے جنہیں قوم یہ ذمہ داری سونپے۔ (روزنامہ مسلم۔ اسلام آباد۔ ۵ مئی ۱۹۸۱ء)

یہ اصول قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق ہے۔ اس کی رُو سے مملکت پوری کی پوری اُمت کی ہوتی ہے اور وہی اسے چلانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اقتدارِ حکومت کے وراثتاً منتقل ہونے کا سوال تو موجودہ حکمرانوں کے بعد ہوگا۔ جس اصول کو آپ نے سب سے پہلا قرار دیا ہے، اس پر بلا تاخیر عمل پیرا ہونا لازم قرار پاتا ہے۔ کسی غلط اقدام کو کالعدم قرار دے کر، اس کی جگہ صحیح راستہ اختیار کر لینے کو قرآن کی اصطلاح میں توبہ کہا جاتا ہے۔ اور توبہ کے متعلق اس نے کہا ہے کہ

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (۴/۱۷)

بارگاہِ خداوندی میں توبہ ان کی قابلِ قبول ہوتی ہے جو اگر لاعلمی سے کوئی غلط کام کر بیٹھیں تو اس کا علم ہو جانے کے بعد، بلا تاخیر اس کی اصلاح کر لیں۔ اسی سے غلط اقدام کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ خدا سب کچھ جانتا ہے اور اس کا ہر قانون حکمت پر مبنی ہے۔

اس کے بعد ہے:۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۴/۱۸)

ان لوگوں کی توبہ قابلِ قبول نہیں ہوتی جو علم ہو جانے کے بعد بھی غلط اقدامات پر مصر رہیں اور ان پر اس وقت نادم ہوں جب موت ان کے سامنے آ کھڑی ہو۔ یا وہ احکامِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کی حالت ہی میں دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ ان کے لئے خدا نے الم انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

چونکہ موت کے متعلق کسی کو علم نہیں ہو سکتا کہ وہ کب آ جائے گی، اس لئے مندرجہ بالا ارشاداتِ خداوندی کا واضح مفہوم یہ ہے کہ غلط اقدامات کا علم ہو جانے کے بعد بلا تاخیر ان کی اصلاح کر لینی چاہیئے۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ خدا کے الم انگیز عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ بارگاہِ خداوندی میں وہی سرخرو حاضر ہو سکتے ہیں جو بلا تاخیر اصلاح کر لیں۔

۶۔ صدرِ مملکت کے مندرجہ بالا اعلانات کے بعد (کہ قرآن کا آئین ہی بلند و بالا ہے۔ اور حکومت وہی جائز قرار پا سکتی ہے جسے قوم سونپے) ہم نے اپنا فریضہ سمجھا ہے کہ قرآن کریم کی ان تصریحات کو واضح کر دیا جائے۔ خدا کرے کہ ہماری یہ مخلصانہ اور بہی خواہانہ معروضات، صدرِ مملکت تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد ان کا اور ان کے خدا کا معاملہ ہے۔ ہم اسی حد تک مکلف ہیں۔

۷۔ صدرِ مملکت نے یہ اعلان کر کے کہ دراصل ملوکیت خلافِ اسلام ہے، جس جرأت مندانہ حق گوئی کا ثبوت دیا ہے، اس کے لئے بھی وہ سزاوارِ تہنیت ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(اُمّت میں ایک سیاسی پارٹی بھی قرآن کے خلاف ہے)

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ آپ نے مئی ۱۹۸۱ء میں طلوعِ اسلام کے لمعات میں "اُمّت میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو غیر اسلامی قرار دیا ہے اور اس باب میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ ایک پارٹی کو بھی خلافِ اسلام ٹھہرایا ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ ایک سیاسی پارٹی تھی اور طلوعِ اسلام سب سے زیادہ اس کا حامی اور مؤید تھا۔ اگر اس وقت اُمّت میں ایک سیاسی پارٹی خلافِ اسلام نہیں تھی تو اب وہ کس طرح خلافِ اسلام قرار پا جائے گی۔ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

سوال اہم ہے اور اس کی وضاحت کی ضرورت واقعی۔ اس کے لئے ہمیں تاریخ کے بہت سے اوراق پیچھے کی طرف الٹنے ہوں گے اور گہرے غور و تدبر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا۔

تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد (اوائل ۱۹۴۸ء میں) مسلم لیگ کی تنظیم نو کا سوال اٹھایا گیا۔ طلوعِ اسلام کا اجراءِ نو جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا۔ اس نے اپنی اشاعت بابت مئی ۱۹۴۸ء میں مجوزہ تنظیم نو ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ سرے سے مسلم لیگ (اور دیگر سیاسی پارٹیوں کو) بھی خلافِ اسلام قرار دیا۔ اس نے اپنی طویل تنقید میں جس کا عنوان تھا۔

مسلم لیگ کو بہ حیثیت پارٹی ختم کر دیا جائے!

لکھا تھا:۔

> اب تک مسلم لیگ برّصغیر ہند کی تمام سیاسی جماعتوں میں کی ایک جماعت تھی۔ چونکہ اس کے نظریہ اور پیش نہاد سے اختلاف رکھنے والے گروہ ملت میں موجود تھے اس لئے ہندو اور انگریز کے مقابلہ میں رائج اور عام جمہوری ضوابط کے مطابق، اسے یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ ملت کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ بدیں غرض اسے انتخابی معرکوں سے دوچار ہو کر عمومی نمائندگیٔ ملت کا ثبوت مہیا کرنا پڑا۔ ۱۹۴۵ء کے انتخاباتِ عامہ اسی ایشو پر لڑے گئے تھے کہ مسلمانانِ ہند پاکستان چاہتے ہیں اور مسلم لیگ کو اپنی واحد نمائندہ جماعت سمجھتے ہیں۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ مئی ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۳)

یہ تھی متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کی وجہِ جواز۔ قائدِ اعظمؒ کا دعویٰ تھا کہ ملتِ اسلامیہ کا مطالبہ یہ ہے کہ

مسلمانوں کی اکثریت کے علاقہ میں ان کی آزاد مملکت قائم کی جائے۔ ان کے مقابلہ میں ہندو اور انگریز نے خود مسلمانوں کی کچھ ایسی پارٹیاں کھڑی کر دیں جو کہتی تھیں کہ قائدِ اعظمؒ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ آزاد مملکت کا مطالبہ، مسلمانانِ ہند کا مطالبہ ہے۔ قائدِ اعظمؒ ان کے نمائندہ نہیں ہیں۔ اس کی تردید کے لئے ضروری تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت کا یہی مطالبہ ہے اور قائدِ اعظمؒ ان کے واحد نمائندہ ہیں۔ یہ ثبوت مسلم لیگ بہم پہنچاتی تھی۔ طلوعِ اسلام نے متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کی وجہ جواز بیان کرنے کے بعد کہا کہ حصولِ پاکستان کے بعد وہ وجہ جواز ختم ہو گئی ہے۔

> لہٰذا ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ مسلم لیگ کو بطور پارٹی ختم کر دیا جائے۔ قیامِ پاکستان تک تو اس کی ضرورت تھی۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔ کسی پارٹی کی بھی ضرورت نہیں۔
> (ایضاً۔ صفحہ ۹۸)

یہ مئی ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ اور اس کے بعد طلوعِ اسلام برابر اس بات کو دہراتا رہا کہ اُمّت میں پارٹیوں کا وجود خلافِ اسلام ہے، اس لئے یہاں کسی پارٹی کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔

طلوعِ اسلام کا یہ مؤقف کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر ..... نہیں تھا بلکہ دین کا تقاضا تھا، اس لئے وہ اس میں کسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس باب میں اس کا اصرار کس حد تک شدید تھا اس کا اندازہ طلوعِ اسلام کی اگلی اشاعت (بابت جون ۱۹۴۸ء) سے لگ سکتا ہے۔

طلوعِ اسلام کے دل میں قائدِ اعظمؒ کا کس قدر احترام ہے اور وہ ان کی عظمت کا کس قدر معترف ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قائدِ اعظمؒ نے اپریل ۱۹۴۸ء میں پشاور کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ملک کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں صرف ایک پارٹی رہے۔ اور وہ مسلم لیگ ہو، اس لئے۔

> آپ متحد ہو کر مسلم لیگ سے وابستہ رہیئے کیونکہ اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔

قائدِ اعظمؒ کی عقیدت و احترام کے باوجود، طلوعِ اسلام نے اس کی سخت مخالفت کی اور لکھا کہ

> ہم نے جو کچھ سابقہ اشاعت میں لکھا تھا...... اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لایئے۔ ہمارے اربابِ حل و عقد کا ارشاد ہے کہ مختلف پارٹیوں کا وجود مملکتِ پاکستان کے لئے سخت خطرناک ہوگا ــــ بالکل بجا اور درست ــــ لیکن وہ اس کا علاج کیا بتاتے ہیں؟ یہ کہ ان کی اپنی پارٹی (مسلم لیگ) موجود رہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی بننے نہ پائے۔ اور اگر بن جائے تو باقی نہ رکھی جائے۔ معترضین کا اعتراض یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس کونسی "آسمانی سند" ہے کہ اس کا وجود ضرور رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی نہ رہے۔ آپ غور کیجئے کہ دنیا میں پارٹی بازی اور گروہ بندی کی بنیاد ہی اس غلط اصول پر ہے کہ ایک پارٹی یہ چاہتی ہے کہ میرا وجود ضرور رہے لیکن کوئی دوسری پارٹی میرے مدِّمقابل نہ آئے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور کوئی دوسری پارٹی حق پر نہیں۔ لیکن

آپ سوچیئے تو بعینہٖ یہی دلیل اس پارٹی کے مقابل دوسری پارٹی دے رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طرح بیسیوں پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں اور ایک دوسرے کی ضد سے قائم رہتی ہیں۔ غور کیجئے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنے کا یہ طریق نہیں کہ آپ اپنی پارٹی کو برسرِ حق قرار دے کر اس کے وجود کو قائم رکھیں اور باقی پارٹیوں کو باطل ٹھہرا کر ان کا استیصال کرنے لگیں۔ اس طرح سے پارٹیوں کا وجود کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ان کے ختم کرنے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ وہی طریق ہے، جسے قرآن نے تجویز کیا ہے —— کہ کسی پارٹی کا وجود ہی نہ رہے۔ جب پارٹیاں ختم ہو جائیں گی تو ملّت باقی رہ جائیگی، جس طرح جب فرقے ختم ہو جائیں گے تو باقی مسلمان رہ جائیں گے —— آگے بڑھیئے تو جب قومیں ختم ہو جائیں گی تو باقی انسانیت رہ جائے گی۔ یہی قرآن کا مقصود ہے۔

(طلوعِ اسلام - جون ۱۹۴۸ء - صفحہ ۴۴)

(ضمناً) آگے بڑھنے سے پیشتر یہ بھی دیکھتے جائیے کہ شخصیت پرستی اور اصول پرستی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام کے دل میں، قائدِ اعظمؒ کا جو احترام تھا (اور ہے) وہ ان کے مبنی بر صداقت اصولوں کی وجہ سے ہے جن کے وہ علمبردار تھے۔ انہوں نے جونہی ان اصولوں میں سے کسی کے خلاف کچھ کہا، طلوعِ اسلام نے انہیں فوراً ٹوک دیا۔ یہ اصول پرستی کا تقاضا تھا۔ اگر وہ ایسے مقام پر بھی ان کی تائید کرتا، یا کم از کم خاموش ہی رہتا تو یہ شخصیت پرستی ہوتی جس کی قرآن اجازت نہیں دیتا۔

طلوعِ اسلام کا مسلک شروع سے اصول پرستی رہا ہے، شخصیت پرستی نہیں —— مذہب شخصیت پرستی سکھاتا ہے، دین، اصول پرستی!

—— (۰) ——

مندرجہ بالا اقتباس میں (پارٹی بازی کے خلاف) جو دلیل دی گئی ہے، وہ درحقیقت قرآن کریم کی پیش فرمودہ ہے۔ اس نے اُمّتِ مسلمہ کو وارن کیا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ -- دیکھنا! تم کہیں مومن ہونے کے بعد مشرک نہ ہو جانا - مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ...... یعنی! ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ اور فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ جب کوئی قوم اس طرح پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جائے تو ان کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ اور پارٹی اپنے آپ کو حق پر سمجھتی ہے اور باقیوں کو باطل پر: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ٥ (۳۰/۳۲)

(ضمناً) جب اُمّتِ مسلمہ میں مذہبی فرقے پیدا کرنے کی سازش کی گئی تو اس سلسلہ میں نہایت چابکدستی سے ایک روایت وضع کی گئی جس میں کہا گیا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت میں تہتّر فرقے ہوں گے۔ ان میں سے ایک فرقہ ناجی (نجات یافتہ) ہوگا اور باقی جہنّمی —— اس میں جو ایک فرقہ کی استثنیٰ کی گئی (کہ وہ ناجی ہوگا) اس نے تہتّر کے تہتّر فرقوں کے لئے وجہ جواز مہیا کر دی۔ ان میں سے ہر ایک نے یہ سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ ہمارا فرقہ ناجی ہے اور باقی فرقے جہنّمی۔ اس طرح یہ فرقے آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی

رہے اور باقی بھی، حالانکہ اُمّت میں فرقوں کا وجود ہی شرک ہے خواہ ایک فرقہ بھی کیوں نہ ہو۔
یہی صورت اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب آپ ایک سیاسی پارٹی کے وجود کو جائز قرار دیدیں۔
اسی لئے قرآن نے ملّت میں مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کو بالکلیہ خلافِ اسلام قرار دیا ہے۔
اس میں ایک کی بھی استثنیٰ نہیں۔ اور اسی سے فرقے اور پارٹیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

(۰)

بہرحال مسلم لیگ کو بدستور آسمانی سند عطا کی جاتی رہی، اور اس کے تصدق ملک میں سیاسی پارٹیاں، برساتی مینڈکوں کی طرح ابھرتی چلی گئیں۔ اور طلوعِ اسلام اپنی اس پکار کو برابر دہراتے چلا گیا کہ یہ سب خلافِ اسلام ہے ـــــ لیکن اسلام کی اہمیت کا احساس کسے تھا؟ اس نے ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

ایک بار پھر سُن لیجئے کہ ہماری معروضات کیا ہیں؟ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اب پاکستان کے تمام مسلمان ایک جماعت کے افراد ہیں اور ایک ہی پارٹی (ملّتِ اسلامیہ) کے ممبر..... اس جماعتِ مسلمین کے اندر ایک الگ پارٹی کا وجود، جماعت میں تفرقہ اور انتشار کا موجب ہے۔ ..... اگر آپ جماعتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے اندر ایک پارٹی (مسلم لیگ) کی تشکیل کی اجازت دیں گے تو آپ دوسری پارٹیوں کو وجود میں آنے سے روک نہیں سکیں گے۔
(طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۴۸ء۔ صـ۵۲)

اس نے فروری ۴۹ء میں، اس موضوع پر پھر تفصیل سے لکھنے کے بعد کہا کہ
ملّت میں کسی پارٹی کی گنجائش نہیں، خواہ وہ پارٹی مسلم لیگ ہی کی کیوں نہ ہو۔ جب ایک پارٹی کو گوارا کیا جائے گا تو پھر ہر پارٹی کو گوارا کرنا ہوگا۔ اسی کا نام انتشار ہے، اور نتیجہ فساد۔ (صـ۳۲)

اور اگست ۱۹۴۹ء میں ضروری تصریحات کے بعد کہا:۔
یاد رکھیئے! ملّت فی نفسہٖ ایک پارٹی ہے۔ اس کی مزید تقسیم مہلک ہے۔ لہٰذا پارٹیوں کے بتوں کو توڑیئے اور ملّت میں گم ہو جایئے ـــــ کہ یہی ہے اُمّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ۔ (صـ۵۲)

(۰)

قوم نے قرآن کی آواز پر کان نہ دھرا۔ ملک میں پارٹی بازی کی وبا عام ہوتی گئی اور انتشار پھیلتا چلا گیا۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں، طلوعِ اسلام کو پھر ایک بھرپور مقالہ سپردِ قلم کرنا پڑا جس کے اخیر میں اس نے ملخصاً لکھا:۔

اس صورتِ حالات کا علاج صرف ایک ہے ..... اور وہ یہ کہ
(۱) مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اس کا وجود ملّت میں تشتت و افتراق کا موجب ہے۔

(ii) مسلم لیگ کو ختم کرنے کے بعد ملک میں پارٹیاں بنانے کو قانوناً جرم قرار دے دیا جائے تاکہ ملک اس لعنت سے پاک ہو جائے۔

(iii) اس طرح پوری کی پوری اُمّت، ایک جماعت بن جائے گی۔

(طلوعِ اسلام - جنوری ۱۹۵۲ء - صفحہ ۶۔ نیز جون ۱۹۵۴ء - صفحہ ۸)

جب ۱۹۵۶ء میں قوم میں تشتت و انتشار کے شعلے پھر سے اٹھے تو ہم نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد لکھا کہ

> باندریں حالات ہم ارباب لیگ سے ایک مرتبہ پھر وہی گذارش کریں گے جیسے ہم نے ۱۹۴۸ء میں پیش کیا تھا اور جسے اس کے بعد ہم اس تکرار اور اصرار سے دہراتے رہے ہیں کہ آپ مسلم لیگ کو ختم کیجئے اور اس ملک کو پارٹی بازی کی لعنت سے نجات دلائیے۔ پوری کی پوری ملت ایک پارٹی ہے اس پارٹی کے اندر پارٹیاں مت پیدا کیجئے۔ (طلوعِ اسلام - مئی ۱۹۵۶ء - صفحہ ۷)

اس کے لئے ہم نے پھر اسی سابقہ دلیل کو دہرایا کہ

> ہندوستان میں دو قومیں بستی تھیں - ایک مسلم دوسری غیر مسلم - وہاں اس کی ضرورت تھی کہ مسلم قوم کی نمائندہ جماعت الگ ہو - یہ جماعت مسلم لیگ تھی۔ حصولِ پاکستان کے بعد وہ مقصد ختم ہو گیا جس کے لئے مسلم لیگ وجود میں آئی تھی - اب یہاں پوری کی پوری ملت ایک جماعت کی حیثیت رکھتی ہے - اس لئے ملت کے اندر کسی پارٹی یا جماعت کی ضرورت نہیں۔ ملت کے اندر مختلف پارٹیوں کے وجود کو قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ (ایضاً - صفحہ ۶)

آپ نے غور فرمایا کہ طلوعِ اسلام نے متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے وجود کو کیوں ضروری قرار دیا تھا، اور وہ پاکستان کی سیاسی پارٹیوں، حتیٰ کہ ایک پارٹی کو بھی کیوں خلافِ اسلام قرار دیتا ہے۔ اصل حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سن لیجئے (جسے ہم تیس برس سے دہراتے چلے آ رہے ہیں) کہ قرآن کی رو سے، سلطنت پوری کی پوری اُمّت کو عطا ہوتی ہے، نہ کہ کسی خاص فرد، گروہ یا پارٹی کو۔ اور اس مملکت میں حکومت "بی پوری کی پوری اُمّت کے مشورہ سے قائم ہوتی ہے" نہ کہ کسی خاص پارٹی کے۔ اُمّت میں تفرقہ (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) اور اسلام باہم متضاد ہیں، اور کسی صورت میں یکجا نہیں ہو سکتے۔

(ضمناً) ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت سیاسی پارٹیوں کو تو خلافِ اسلام قرار دیتی ہے لیکن مذہبی فرقوں کو نہیں!

باقی رہا یہ اعتراض کہ پارٹیوں کے بغیر جمہوری نظام قائم نہیں ہو سکتا، تو سوال یہ ہے کہ آپ اسلامی نظام کے لئے مغربی جمہوریت کو سند اور بنیاد قرار دیتے ہیں، یا قرآن کو؟ اس کا ایک سُو ہو کر فیصلہ کیجئے اور دھڑلے سے اس فیصلہ کا اعلان۔ اس سے تمام اعتراضات رفع اور شکوک زائل ہو جائیں گے۔ ہماری ساری مصیبت ہماری منافقت کی پیدا کردہ ہے۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے!

(۰)

یومِ اقبالؒ ۱۹۸۱ء پر خطاب

احترامِ آدمیّت

دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو

پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

خطاب بتقریب یومِ اقبالؒ

(۲۴ اپریل ۱۹۸۱ء)

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر! اسلام و رحمت!

جو حضرات میرے ہفتہ واری درسِ قرآن مجید میں شریک ہوتے ہیں، یا جن کی نگاہوں سے میری تحریریں گزرتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں کس طرح قرآنی حقائق کی تشریح و تفسیر، کلامِ اقبالؒ سے کرتا ہوں۔ اس سے جہاں قرآنی معارف وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں، وہاں خود اقبالؒ کا شعر بھی فلک بوس بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقبالؒ کا احسان حد درجہ فراموش ہو جاتا ہے۔ عالمگیر انسانیت پر احسان اس اعتبار سے کہ اس وقت اقوامِ عالم جن زہرہ گداز مصائب اور اضطراب انگیز آلام کا شکار ہو رہی ہیں اُس نے انہیں ان سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتایا۔ ملتِ اسلامیہ ہند پر اس کا یہ احسان کہ اس نے، ان کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کی نشاندہی کی جس میں وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کر کے صحیح آزادی حاصل کر سکیں۔ اور پھر ان کا احسانِ عظیم اس ہیچمدان پر کہ جس کی قرآن فہمی کا طریق فکرِ اقبالؒ کا رہینِ منت ہے۔ یہی ہے احساناتِ اقبالؒ کی وہ سہ گونہ اہمیت جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے میں ایسی تقاریب پر خصوصی خطاب پیش کیا کرتا ہوں۔

جیسا کہ آپ نے اعلان میں دیکھ لیا ہوگا، میرے آج کے خصوصی درس کا موضوع ہے: ؎

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!

یعنی اسلام کا ملخص اور شریعتِ قرآنیہ کا منتہیٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔

اقبالؒ نے ان دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں، اسلام کے مقصود و منتہیٰ کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ قرآنِ کریم کا اعلان ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ... ۝ (۱۷/۷۰)۔ خدا نے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی جہت سے

واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ آپ دیکھئے! اس میں کافر و مومن کی تمیز و تفریق نہیں۔ (یہ تفریق آگے جاکر شروع ہوتی ہے) اس لئے ہر انسان کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اور یہی (شرف و تکریم انسانیت) پیغامِ اقبالؒ کا بھی منتہیٰ ہے ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است — اصلِ تہذیب، احترامِ آدم است

اس، مقصود و مطلوبِ پیامِ خداوندی کے بعد، اقبالؒ نے بتایا ہے کہ انسان کو اس عزت و تکریم سے محروم کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس نے (بصیرتِ قرآن کی روشنی میں) کہا ہے کہ مستبد قوتیں سامانِ رزق کو اپنے قبضے میں لے کر، کمزور انسانوں کو ضروریاتِ زندگی کے لئے ان کا محتاج بنا دیتی ہیں، اور جب وہ ان کا محتاج ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا محکوم بنا لیتی ہیں۔ قرآنی نظام، رزق کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج ہی نہیں رہتا۔ اور جب وہ کسی انسان کا محتاج نہیں رہتا، تو کسی کا محکوم بھی نہیں بنتا۔ اس (اقبالؒ) نے جنّتِ ارضی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ؎

جنّتِ ارضی

کس در اینجا، سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست!

چونکہ اس میں کوئی بھی اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے اس معاشرہ میں غلام اور آقا۔ حاکم اور محکوم کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔ اقبالؒ نے جو کہا ہے کہ ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے — تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

تو وہ اسی جنّتِ ارضی کی خصوصیّت ہے جو قرآنی نظام سے وجود میں آتی ہے۔

---(-)---

شاعر نہیں

اقبالؒ کے متعلق ہماری بنیادی غلط نگہی یہ ہے کہ ہم نے اسے یا تو ایک شاعر سمجھا ہے اور یا فلاسفر ـــــ قوم نے اسے جو سب سے بڑا "اعزاز" بخشا ہے، وہ "شاعرِ مشرق" کا ہے۔ وہ عمر بھر کہتا رہا کہ بابا! میں شاعر نہیں! ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

بلکہ تنگ آکر یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ؎

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم — مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ بر ما تہمتِ شعر و سخن بست

یہ اس لئے کہ ؎

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

نہ فلاسفر

جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، اس نے دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی کہ ـــــ ہے فلسفہ زندگی سے دوری! ـــــ اور فلاسفرز سے برملا کہا کہ ؎

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے — بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

چنانچہ وہ عمر بھر، زمین کے ہنگامے سہل کرنے کی تدابیر سوچتے رہے۔ ان ہنگاموں میں سرِفہرست روٹی کا مسئلہ ہے۔ جس سے محرومی سے محتاجی پیدا ہوتی ہے۔ جو شرف و تکریم انسانیت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔

یہ مسئلہ کب سے ان کی توجہ کا مرکز بنا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ یوں تو ہمارا دور، اقتصادیات کا زمانہ (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے لیکن ہمارے ہاں اس نے بہت مدت سے .... عرصہ سے اہمیت اختیار کی ہے۔ اقبالؒ کا قلب حساس اور نگہ دوربین اس کی منتظر نہیں تھی کہ یہ مسئلہ یہاں اہمیت اختیار کرے تو وہ لب کشائی کرے۔ اُردو زبان میں اقتصادیات پر سب سے پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مصنف اقبالؒ تھے، حالانکہ تعلیم کے زمانے میں اقتصادیات (اکنامکس) ان کا

علم الاقتصاد

اعلیٰ مضمون بھی نہیں تھا۔ اور ان کی عمر بھی تیس بتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی سی عمر میں فلسفہ کے اس... طالب علم نے وہ کتاب لکھی جس کے دیباچہ میں کہا:-

اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشتناک تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ (اقبالؒ اور قرآن ص۱۶۱)

اس کے بعد یہ نوجوان، مزید تعلیم کے حصول کیلئے یورپ چلا گیا۔ اس زمانے میں یورپ میں، نظامِ سرمایہ داری انتہائی عروج پر تھا۔ یہ نظام کن بنیادوں پر استوار تھا، اس کے متعلق میں اس مقام پر صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا۔ اس نظام کے ایک علمبردار (WILLIAM TOWNSEND) نے ایک کتاب لکھی تھی — (DISSERTATION ON THE POOR LAWS) اس میں اس نے کہا تھا:-

بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تندخو سے تندخو جانور کو رام کر دیتا ہے۔

اس سے سرکش سے سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک ——— بھوک ہی وہ، جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔
(بحوالہ۔ نظامِ ربوبیت، صفحہ ۳۲۳)

یورپ میں اقبالؒ نے ان کوٹھوں کے خونچکاں زخموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹۱۱ء میں، علی گڑھ میں، وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کا شہرہ آج تک قائم و دائم ہے۔ (مولانا) ظفر علی خان (مرحوم) نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا ——— ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ——— اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:۔

مسلمانوں کا اِفلاس

یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر روٹی کے ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جا نکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اُٹھ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پسار دیں۔ ہمارے نوجوان علم بردارانِ اصلاحِ تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قومی روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا اِفلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔ (بحوالہ مضامین اقبالؒ۔ مرتبہ تصدق حسین تاج۔ صفحہ ۱۰۳)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ "عمر بھر" بھوک سے کراہنے والوں کی دلخراش صداؤں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے "مصروفِ جہاد رہے۔ اس کا علاج، قرآن کے معاشی نظام کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور عطا فرمایا تھا۔

(۰)

علامہ اقبالؒ کے اس جہاد کے تین نمایاں مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قلتِ وقت کے پیشِ نظر، میں ان مراحل پر مختصر انداز سے روشنی ڈال سکوں گا۔

مرحلۂ اوّل ــــ محنت کشوں کا مسئلہ

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد، یورپ کی قوتیں جس طرح ترکی کے حصے بخرے کر کے، اس کی قوت اور شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے درپے تھیں، اس کے احساس سے اقبالؒ کے قلبِ دردآگیں کی فلک رس صدائیں، اس زہرہ گداز نظم کی صورت میں لرزہ انگیز ہوئی تھیں جس کا عنوان "خضرِ راہ" ہے۔ اس کا عمودی موضوع تو یہ تھا کہ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

لیکن اس میں اُن اہم مسائل کا حل بھی (بزبانِ خضر) پیش کیا گیا ہے جن سے اس زمانے میں دنیا دوچار اضطراب تھی۔ اس میں ایک اہم ترین مسئلہ "سرمایہ و محنت" کا بھی ہے۔ اس کے متعلق اقبالؒ کے سوال کے جواب میں خضر کہتا ہے: ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیامِ کائنات!
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزدیاں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!

اٹھ! کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے! (بانگِ درا)

یہ ۲۳-۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ اس کے بعد، پیامِ مشرق کے آخری باب میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث سامنے آتی ہے۔ لیکن ایک تو وہ بحثِ عمیق فلسفیانہ ہے اور دوسرے وہ فارسی زبان میں ہے، اس لئے ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، بالِ جبریل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں، دو تین مربوط نظمیں بڑی دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ اس سلسلہ کی پہلی نظم کا عنوان ہے۔

لینن ــــ خدا کے حضور

جیسا کہ معلوم ہے، مارکسزم کا مشہور لیڈر اور مفکر، لینن، خدا، وحی، آخرت، سب کا منکر تھا۔ اس کا "خدا کے حضور" نظر آنا بڑا تعجب انگیز سا ہے لیکن وہ اپنے سوال تک پہنچنے سے پہلے، اس معمہ کو خود ہی حل کر دیتا ہے جب کہتا ہے کہ جو گتھی فلسفہ نہیں سلجھا سکتا تھا، اسے عینی مشاہدہ نے حل کر دیا۔ تو (خدا) میرے سامنے ہے اس لئے تیرے وجود سے اب کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ اس تمہید کے بعد وہ کہتا ہے: ؎

اِک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات!
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے — کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا — جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کے اس اسلوبِ بیان میں، وہ لینن کس طرح چلمنی انداز سے سامنے آرہا ہے جو زندگی بھر خدا کا منکر ہی نہیں، انتہائی درجہ کا سرکش تھا، اور اب خدا سے مخاطب! اس کی (سابقہ) خوئے سرکشی، روح میں تلاطم بپا کر رہی ہے، لیکن احترامِ خداوندی، دل کی بات کو گویا کا نہ زبان تک آنے کے رستے میں حائل ہے۔ بات حلق تک آتی ہے، پھر لوٹ جاتی ہے۔ جھجکتے اور لرزتے ہوئے، بصد توقف و تامّل، اسے پھر نوکِ زبان تک لانے کی کوشش (بلکہ جرأت) کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تامّل اور اضطراب تھا جس سے تنگ آکر ایک وقت غالبؔ ہجومِ پیچ و تاب نے کہا تھا کہ ~

از سینہ تا بحلق بصد آزرم رفتہ و نیم این نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

اب سنیئے وہ بات جسے لینن اس صبر آزما توقف کے بعد زبان تک لایا۔ کہا کہ میں جانتا ہوں کہ "تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات" ہے، لیکن میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ~

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

یہ پوچھنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ~

مشرق کے خداوند، سفیدانِ فرنگی مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

مشرق میں 'سفید فام مغربی اقوام کی پرستش ہوتی ہے۔ اور مغربی اقوام چاندی سونے (دولت) کی پرستار ہیں۔ ان دونوں کے خدا تو یہ ہیں! میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کونسے آدم کے خدا ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کا تبیانِ حقیقت کا انداز کس قدر بلیغ اور حسین ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت خدا کی حکمرانی دنیا میں کہیں بھی نہیں، اس لئے لینن کا یہ سوال بالکل فطری ہے' اور ایسا جس کا جواب کوئی نہیں بن پڑ سکتا ـــــ کہ وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا معبود؟ ـــــ ہم پر تو منکرینِ خدا ہونے کا الزام دھر دیا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خدا کے مومن کون ہیں، اور وہ کس دنیا میں بستے ہیں؟

اقبالؒ نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ ـــ نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری ـــ اور ـــ یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری ـــ وہ نہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، نہ دوسروں کو یہ کہہ کر فریب میں رکھنا چاہتا ہے کہ دنیا میں نوّے کروڑ مومن بستے ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ~

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں! ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اس میں نہ مشرق کا استثناء ہے نہ مغرب کی تمیز!

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

لینن کہتا ہے کہ اہلِ مشرق جن (مغربی) خداؤں کو پوجتے ہیں، ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ ~

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!

اس کے بعد وہ اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالتا ہے، اور کہتا ہے کہ ~

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

دنیائے اخلاق کا ایک قدیم معمّہ ہے جسے ذہنِ انسانی آج تک حل نہیں کر سکا۔ معمّہ یہ ہے کہ

اگر خدا خیر ہے، تو دنیا میں شر کا وجود کیوں ہے؟

اگر شر کا وجود اس کی مرضی سے ہے تو وہ خیر نہیں۔

اور اگر شر کا وجود اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ قادرِ مطلق نہیں۔

لینن نے خدا سے کہا ہے کہ تیرا دعویٰ ہے کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔

عدل کا تقاضا ہے کہ بندۂ مزدور کو اس کی محنت کا ماحصل ملے لیکن وہ نہیں مل رہا اور بندۂ مزدور کے اوقات سخت تلخ ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ خدا عادل تو ہے لیکن اس کے فیصلے عملاً نافذ نہیں ہوتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ قادر نہیں (JUDICIARY) تو اس کے پاس ہے لیکن (EXECUTIVE) اس کے پاس نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے عادل ہونے کا فائدہ کیا ہے!

اور اس کے بعد وہ اس نہایت پیچیدہ سوال کا جواب خود ہی دیتا ہے کہ میں مانتا ہوں کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔ لیکن تیرا قانون یہ ہے کہ انسان کے عمل اور اس کے نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے میں، مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اور یہ خود تقاضائے عدل ہے جس طرح دنیاوی قانون کی رُو سے بھی حاملہ عورت کی سزائے موت، وضعِ حمل تک ملتوی کر دی جاتی ہے۔ اس قانونِ مہلت کی رُو سے وہ پوچھتا یہ ہے کہ ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

یہ نہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ سرمایہ پرستی کا سفینہ ڈوبے گا یا نہیں۔ سوال صرف "کب" کا ہے۔ یہ کب ڈوبے گا؟ تیری دنیا اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے! اس لئے آپ ذرا جلدی کریں۔

(۰)

"کب" کا یہ سوال فرشتوں کے دل میں بھی مچل رہا ہے جس کا تذکرہ اگلی نظم میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــ فرشتوں کا گیت

فرشتوں کا گیت

قرآنِ مجید نے قصّۂ آدم، اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کسی خاص شخص (آدم) یا ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کا تذکرہ نہیں۔ وہ خود آدمی کی داستانِ حیات ہے وہ تاریخِ انسانیت کا تمثیلی بیان ہے۔ اس تمثیل میں یوں سمجھئے گویا ایک مجلس میں خدا اور اس کے فرشتے بیٹھے ہیں اور بات اس مخلوق کی ہو رہی ہے جسے دنیا میں صاحبِ اقتدار بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ (وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ط ..... (۲/۳۰) ملائکہ جب اس ہیولائے آب و گل پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ وہ عرض کرتے ہیں: (اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ) بارِ الٰہا! جرأت معاف ہو تو ہم عرض کریں کہ کیا تو کرۂ ارض کو ایسی مخلوق کے حوالے کرنا چاہتا ہے جو وہاں خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی؟ جواب ملا: (اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ..... (۲/۳۰)

گھبراؤ نہیں! ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اس پر فرشتے خاموش ہو گئے اور نہایت گہری نظروں سے تاریخِ انسانیت کا مطالعہ، بلکہ مشاہدہ کرتے رہے۔ جو کچھ وہ دیکھتے اس پر بڑے ضبط اور صبر سے کام لیتے۔ لیکن ضبط کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے؟ ہمارے دور میں پہنچ کر، جب انہوں نے آدم کی عالمگیر سفاکیوں اور تباہ کاریوں کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا، اور ایک دن بارگاہِ خداوندی میں لب کشائی کی جرأت کر ہی لی۔

لیکن ملائکہ کی جرأتِ لب کشائی اور ابلیس کے استکبار میں بڑا فرق تھا۔ انہوں نے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے حرفِ تمنّا میں طعن و تشنیع کا کھلا ہوا نشتر نہ سہی چھپی ہوئی پھانس ضرور تھی۔ ملائکہ کی عرض داشت کا انداز کچھ اور تھا۔ انہوں نے کہا... ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اس "ابھی" میں گہری حقیقتیں مستور ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا "کیوں؟ کیا وہی نہیں ہوا، جو ہم کہتے تھے؟ کیا آدم ویسا ہی نہیں نکلا جیسا ہم نے اندازہ لگایا تھا؟" انہوں نے کہا یہ... کہ ہمیں اس کا تو یقین ہے کہ آدم ویسا ہی ہوگا جیسا آپ کی مشیت میں تھا، لیکن ابھی تک وہ اس معیار پر پورا نہیں اترا۔ ابھی یہ نقش ناتمام ہے۔

ارتقائی منازل

اور اس میں عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہ کائنات اور انسان، پہلے ہی دن اپنی مکمل شکل میں وجود پذیر نہیں ہو گئے تھے۔ یہ ابتدائی ہیولیٰ کی صورت میں تخلیق کئے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہزارہا ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اس منتہیٰ تک پہنچنا تھا جو ان کا مقصود تھا۔ قرآنِ مجید میں اس سلسلۂ ارتقاء کے شواہد موجود ہیں اور کلامِ اقبالؒ میں اس کی بکثرت تفصیلات۔ ذرا ان دو قطعہ بند شعروں کو دیکھئے ؎

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی؟
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے!

یہ پیکرِ آب و گِل ہنوز ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسے تکمیل تک پہنچنے دو، پھر دیکھنا کہ یہ کیا بنتا ہے ؎

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

ان حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ ملائکہ کی "ابھی" میں کتنے راز سربستہ تھے! انہوں نے عرض کیا تھا کہ بارِ الٰہا! ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

عقلِ حیلہ جو کی اس بے زمامی، عشقِ انسانیت ساز کی اس بے مقامی اور آدم کی ناتمامی کا نتیجہ یہ ہے کہ ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رِند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

دانش و دین و علم و فن، بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز، پردگئ نیام ابھی!
(بالِ جبریل۔ صفحہ ۱۴۵)

ملائکہ کی اس عرضداشت میں اتنا ہی نہیں کہا گیا کہ آدم کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہے کہ فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کی ابلیسی قوتیں ساری دنیا میں برہنہ رقص کر رہی ہیں۔ انہوں نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ جب آدم تکمیل تک پہنچ گیا تو ان میں سے کوئی قوت بھی باقی نہیں رہے گی۔ انہوں نے بھی زیرِ لب یہی کہا تھا کہ بارِ الٰہا! اس میں اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ [ط۱]

ملائکہ کی اس عجلت پسندی کے جواب میں، اگلی نظم میں جس کا عنوان ہے "فرمانِ خدا (فرشتوں سے)" ایک اور بسیط حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے بڑی

فرمانِ خدا

تخریب انگیز غلط فہمیاں پیدا ہوتی (یا پیدا کی جاتی) ہیں، اور ہمارے تشدد پسند کمیونسٹ تو اس شعر کو گلی گلی، کوچے کوچے، گاتے پھرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو! خدا خود "جلاؤ، گھیراؤ" کے طریق کی تاکید کرتا، بلکہ فرشتوں کو ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے اور اقبالؒ اس پیغام کو عام کرتا ہے کہ:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

خدا کے کائناتی ارتقاء کے پروگرام کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کی رُو سے) بڑی سست ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۲۲/۴۷؛ ۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا (۷۰/۴)۔ اگر اس پروگرام میں انسان کے دست و بازو بھی شریک ہو جائیں تو پھر یہ مدت انسانوں کے حساب و شمار کے دنوں میں سمٹ آتی ہے۔ انسانی دنیا میں اس قسم کا انقلاب جماعتِ مؤمنین کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ اس کا طریقِ کار یہ ہے کہ لوگوں کے قلب و دماغ میں انقلاب پیدا کیا جاتا ہے اور ذہنیتوں کے اس انقلاب سے، قوم میں تعمیری انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ یہ طریقِ کار خود خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ... ۝ (۱۳/۱۱) "خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنی ذہنیت میں (نفسیاتی) تبدیلی نہ پیدا کرے"۔ اس طریقِ انقلاب میں کسی قسم کی تخریب نہیں ہوتی، تباہی نہیں ہوتی، فساد نہیں ہوتا، خونریزی نہیں ہوتی۔

لیکن اگر انسانوں کی ایسی جماعت کھڑی نہ ہو۔ اور دوسری طرف، سلب و نہب کی خون آشام

ط۱ بالِ جبریل ہی کے اس شعر کو دیکھئے ؎

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

اور جس تپش و خلش اور سوز و گداز کی یہ فغانِ سحری تخلیق ہے، اس کا اندازہ لگائیے!

قوتیں حدود فراموش ہوتی چلی جائیں، تو پھر مظلوم و محتاج عوام، تنگ آکر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح ہر اس چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کرلے جاتے ہیں جو ان کی لپیٹ میں آجائے۔ وہ سیلاب نہ مسجد و مندر میں تمیز کرتا ہے، نہ ظالم اور مظلوم میں تفریق۔ ان کے جنون خیز پروگرام میں، تخریب ہی تخریب ہوتی ہے۔ تعمیر نہیں ہوتی، یہ انقلاب نہیں ہوتا، فساد ہوتا ہے۔ عام اصطلاح میں اسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے اور قرآن کی اصطلاح میں "عذاب لانے والے ملائکہ"۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کا (وسیع پیمانے پر) "فساد" روس میں برپا ہوا جسے اقبالؒ نے (یوں کہئے گویا) اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی نگہ حقیقت بین دور رس نے دیکھا کہ اس پروگرام میں لا ہی لا (یعنی تخریب ہی تخریب) ہے۔ اِلّا (مثبت یا تعمیر) کا شائبہ تک نہیں۔ وہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ　　لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ　　(ابلیس چہ باید کرد)

میں نے ان کے پروگرام کی مختلف کڑیوں پر غور کیا ہے۔ وہ ظلم و استبداد کی حکومتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ قوتیں، مذہبی پیشوائیت کے سہارے مصروف جور و ستم رہتی ہیں۔ اس لئے وہ مذہب کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا جوش جنوں یہیں تک نہیں رہتا۔ آگے بڑھتا ہے۔ وہ خود خدا کی ہستی کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے ضوابط اخلاق و اقدار کو مسترد کر دیا ہے۔ لینن کے الفاظ ہیں، جو اس نے ۱۹۲۰ء میں، یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانفرنس میں، نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے۔

ہم ان تمام ضوابط اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحی خداوندی) یا طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے۔ یہ تصور زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔۔۔۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطہ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔۔۔۔۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔　　(بحوالہ۔ نظام ربوبیت۔ ص۱۳۳)

یہ ٹھیک ہے کہ اخلاق کا جو ضابطہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، وہ نظام ملوکیت اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفظ کی ضمانت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن اسے مسترد کرتے ہوئے خدا اور مستقل اقدار سے انکار کر دینا، شدت جنون کا نتیجہ ہے۔ جب اخلاق و اقدار کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو پھر معاشرہ میں تبدیلی لانے کے لئے، تشدد اور تلوار کے سوا کونسا طریق رہ جاتا ہے؟ لینن نے، انجلز کے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ، دوسرے حصہ پر اپنا

اختیار اور تسلّط، قوّت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے۔ (نظامِ ربوبیت۔ صفحہ ۳۴۳)

روس کا یہی وہ لآ کا پروگرام تھا جس کے نتائج و عواقب سے متنبہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اس سے کہا تھا کہ، یاد رکھو! ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات ۔۔۔ سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا و اِلّا برگ و سازِ اُمتاں ۔۔۔ نفی بے اثبات، مرگِ اُمتاں

اس کے بعد کہا: ؎

ای کہ می خواہی نظامِ عالمے ۔۔۔ جستۂ او را، اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی؟ فرمایا:۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب ۔۔۔ فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب (اقبالؒ اور قرآن صفحہ ۱۸۹)

ان تصریحات کی روشنی میں کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصوّر کرسکتے ہیں کہ اقبالؒ کمیونزم کا حامی اور اس کے "جلاؤ گھیراؤ" کے تشدد آمیز طریق کار کا مؤید تھا؟ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ شمس الدین حسن نامی، ایک کمیونسٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھ دیا کہ "اقبالؒ ایک اشتراکی ہی نہیں، بلکہ اشتراکیت کے مبلّغِ اعلیٰ ہیں۔" علّامہ اقبالؒ نے ایک دن کے بھی توقّف کے بغیر، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار میں حسب ذیل خط شائع کرا دیا:۔

(۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۳) روسی بالشوزم، یورپ کی ناعاقبت اندیشی اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردّ عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے۔ (اقبالؒ اور قرآن صفحہ ۱۹)

اس کے بعد آپ اس نظم کی طرف آیئے جس کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے اس طولانی تمہید کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس نظم میں درحقیقت، عالمگیر انسانیت کو وارن (WARN) کیا گیا ہے کہ اگر تم نے مستبد قوتوں کی دراز دستیوں کو نہ روکا، تو زمانے کے تقاضے، ایسا سیلاب بلا بن کر ابھریں گے جس کے سامنے، انسانیت کی کوئی متاعِ حیات بھی ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ وارننگ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے ان الفاظ میں دی تھی کہ

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)

اس فتنہ سے بچنے کی کوئی حفاظتی تدبیر کر لو، کہ جب وہ آتا ہے تو اپنے آپ کو ظالموں تک ہی محدود

نہیں رکھا کرتا۔ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک بھی ہے اور مجرموں کا پیچھا کرنے میں انتھک بھی ——— حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

خدا کے اس جلال قانونِ مکافات کی تشریح حضورؐ نے ایک نہایت دلنشیں مثال کی رو سے فرمائی۔ ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:-

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اُن میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے۔ کچھ نیچے کے حصے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا:- بہت اچھا، ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس اقدام سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے اگر روک دیا گیا تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔ جلد دوم۔ باب الفتن)

یہ نتیجہ ہوتا ہے اس طوفان کا جو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہونے والے، عوام کے ہاتھوں بپا ہوتا ہے اور جس کی شعلہ فشانیوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔

ان تشریحات کی روشنی میں اس نظم کو دیکھئے جس کا مفہوم سمجھنے میں، میں سمجھتا ہوں، اب آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ نظم کا عنوان ہے۔

فرمانِ خدا ——— فرشتوں سے

اور نظم ہے:-

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے | کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ | جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی | اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے | پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے[1] | بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے | میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو![2]

---

[1] ایک مشہور شعر ہے:-
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند | حق را بسجودے و نبیؐ را بدرودے!

[2] ضربِ کلیم میں ہے:-
اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے | ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

(۱)

یوں تو اقبالؒ کا پیغام، پوری نوعِ انسان کے لئے تھا لیکن اس کی اوّلیں مخاطب، ملّتِ اسلامیہ (مسلمانوں کی قوم) تھی جو ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، تینوں کی صیدِ زبوں تھی۔ یہ موضوع ایک مستقل تصنیف کا متقاضی ہے۔ اور میں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ اس مظلوم و مقہور قوم سے کہتے ہیں:۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری (جاوید نامہ)

اقبالؒ نے ملّائی و پیری کے خلاف جو کچھ کہا ہے اسے تو سرِدست چھوڑ دیجئے۔ اس نے سلطانی (ملوکیت یا شاہنشاہیت) کے خلاف جو بات کہی ہے، میری نظر سے اس کی مثال کہیں نہیں گذری۔ ہمارا آج کا موضوع "محتاجی" ہے۔ یہ خیالِ عام ہے کہ اور لوگ تو، کم و بیش، کسی نہ کسی کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن بادشاہ (سربراہِ مملکت) کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ سب اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس نکتہ کی تائید میں اقبالؒ کے دلائل تک پہنچیں، اصولی طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ محتاج کہتے کسے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو شخص اپنی محنت سے رزق حاصل کرتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ (یہ اور بات ہے کہ اس کا رزق چھین کر اسے محتاج بنا دیا جائے) محتاج وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے۔ محتاج کی اس (DEFINITION) کے بعد جس کے حقیقت ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا، بالِ جبریل کی اس نظم کو سنیئے جس کا عنوان ہے ــــ گدائی ــــ سنیئے، اور محوِ حیرت رہ جائیے کہ ہم کیا سن رہے ہیں! محوِ حیرت ہی نہیں بلکہ قدرے محجوب بھی کہ ایسی بدیہی بات، اس سے پہلے ہماری سمجھ میں کیوں نہ آئی! جس قدر اس کا موضوع انوکھا ہے اسی قدر اس کا اندازِ بیان بھی شوخ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

گدائے بے حیا

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا — ہے "ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!

ذرا دیکھو کہ:۔

"تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے؟ — کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زرّیں قبا؟
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ مہقاں سے کشید — تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا!
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی — دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا!
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج — کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا[1]

---

[1] بالِ جبریل میں نظم کے آخر میں لکھا ہے (ماخوذ از انوری) لیکن اقبالؒ نے دیگر متعدد مقامات پر بھی اس موضوع کو پیش کیا ہے۔

ایک غزل میں وہ باندازِ دگر اسی خیال کو پیش کرتے ہیں، جہاں کہتے ہیں :ے

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے! خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے!

ایک اور شعر :ے

کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

خودی کی موت اسی گداگری سے واقع ہوتی ہے۔ اس باب میں، وہ عہدِ قدیم کی ملوکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت، دونوں کو ہم سنگ قرار دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ :ے

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

گداگری سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے، اور خودی کی موت کے بعد، کمینگی کی زندگی۔ بالِ جبریل ہی میں علامہؒ نے اس نکتہ کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :ے

اک مفلسِ خوددار یہ کہتا تھا خدا سے میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری!
لیکن یہ بتا، تیری اجازت سے فرشتے کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری؟

مردِ فرومایہ اس لئے کہ — خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

قزاقی

ان مقامات میں تو اقبالؒ نے ان والیانِ مملکت کو "گداگر" کہا ہے۔ ضربِ کلیم کی ایک نظم میں وہ انہیں ڈاکو کہہ کر پکارتا ہے۔ سکندر کے سامنے ایک بحری قزاق، مجرم کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے۔ سکندر اس سے کہتا ہے :ے

صلہ تیرا، تری زنجیر یا شمشیر ہے میری کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی!

قزاق جواب دیتا ہے :ے

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی! کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی!

کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا!

(۰)

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے سامنے لائے بغیر، آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مملکت تو قرآن بھی قائم کرتا ہے۔ اس مملکت کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔ اس سربراہ کو اپنے گزارے کے لئے بہرحال، مملکت کی آمدنی سے کچھ لینا پڑتا ہے جو دوسروں کی محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ تو کیا اسے بھی گدا کہا جائے گا!

آپ ان سربراہانِ مملکت کی زندگی کو سامنے لائیے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ انہیں کیا کہا جائے گا؟

خلیفہ کا وظیفہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ، منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے سے پہلے، کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور خاصے مرفہ الحال تھے۔ خلیفہ منتخب ہونے کے دوسرے دن حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ کپڑے کا گٹھا اٹھائے، بازار کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کدھر جا رہے

ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے کام پر۔ انہوں نے کہا کہ خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر لینے کے بعد، آپ کا وقت آپ کا نہیں رہا، ملت کا ہو گیا ہے۔ اس لئے آپ اسے ذاتی کام کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا نہ کریں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کا انتظام کرنا اُمت کے ذمے ہے۔ چنانچہ سوال درپیش ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ، یعنی حق الخدمت کیا ہونا چاہیئے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا کہ اسے میں خود اپنے لئے مقرر کروں گا۔ چنانچہ آپ نے معلوم کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی یومیہ اُجرت کیا ہے! اس کے مطابق آپ نے اپنا وظیفہ مقرر کیا۔ دوسری روایات میں ہے کہ اسے دیگر صحابہؓ نے مقرر کیا تھا۔ اور معیار تھا قریش کے معمولی فرد کا اندازِ زندگی۔ کچھ بھی تھا۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے اعزا سے کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے..... ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ اس کے متعلق قیامت میں بازپرس ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا حساب یہیں چکا دیا جائے۔ ایک مختصر سا قطعہ زمین میرے پاس ہے۔ اسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم میں نے بیت المال سے لی ہے اسے واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے لئے جو وظیفہ مقرر کیا، وہ یہ تھا:۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو ان کا حال سو میرا حال۔

اس اُجرت کے عوض کام کتنا؟ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا نظم و نسق۔ ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم..... کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پالان پر سوار تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، امیر المؤمنین! کدھر؟ کہنے لگے، بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے، اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ اس اونٹ کو تلاش کرے۔ آپ نے کہا کہ بخدا! یہ تو اونٹ ہے۔ اگر بیت المال کی ایک بکری بھی کہیں گم ہو گئی تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہو گی!

امیر المؤمنین، دن بھر اس قسم کے فرائض سرانجام دیتے تھے، اور راتوں کو گشت کرتے تھے تاکہ رعایا کا حال براہِ راست معلوم کیا جائے اور ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں توقف یا تاخیر نہ ہو۔ یہ اسی قسم کی گشت کا واقعہ ہے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک خیمہ میں ایک عورت کچھ پکا رہی ہے۔ اور دو تین بچے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ آپ کے استفسار پر اس نے کہا کہ کئی وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اٹھے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اپنے خادم، اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔

اسلم نے کہا کہ مجھے دے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا۔ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے۔ اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھا کر لے جانے دو۔ (شاہکارِ رسالت صفحہ ۳۶۳)

”اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ آپ اٹھانا پڑے گا۔“

یہ تھیں وہ خدمات جو یہ سربراہانِ مملکت سرانجام دیتے تھے۔ ان خدمات کی اُجرت ہیں جو کھانا منظور کرایا تھا، اس کی نوعیت یہ تھی کہ ایک دن مصر کا گورنر ملنے کے لئے آیا تو آپ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جَو کی روٹی، زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس نے کہا کہ امیر المومنین! آپؓ گیہوں کے آٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپؓ نے کہا کہ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے؟ اس نے کہا کہ ایسا تو میں نہیں کہہ سکتا! اس پر آپؓ نے فرمایا:۔

عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جَو کی روٹی مل رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جب اسے اس کا اطمینان ہو جائے گا کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی میسّر آ رہی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جو کچھ رعایا سے لیا جا رہا ہے اس کے عوض میں خدمات کس قدر انجام دی جا رہی ہیں۔ کیا کسی کو ایسے کاموں کے لئے اتنا سستا مزدور مل سکتا تھا؟ سستا بھی اور پھر امین بھی! خدمت کے

خدمت کے بغیر کچھ نہیں

بغیر کچھ لینا تو ایک طرف وہ تو خدمت کے بغیر مملکت کے لئے بھی کچھ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے! اس ضمن میں ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان کردہ واقعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں آزادی حاصل ہونے کے بعد، حکومت کے اجباب کی رقم ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں! ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ کہ پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ، جب تمہیں حکومت کی طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لانا۔ (شاہکارِ رسالت صفحہ ۳۶۸)

آپ نے دیکھا کہ سربراہِ مملکت تو ایک طرف، وہاں خود مملکت بھی نہ گداگر ہوتی تھی، نہ قزاق۔ وہ حق الخدمت لیتی تھی۔ اور یہ نہ محتاجی ہوتی ہے نہ گداگری!

نہ محتاج نہ ذلیل

اور جب اس مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا، تو کوئی ذلیل بھی نہیں ہوتا۔ وہ مملکت، احترامِ آدمیت کی زبانی دعویدار نہیں تھی۔ عملاً بھی اس کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ حمص کے حاکم، حضرت عمیر بن سعدؓ کے منہ سے ایک غیر مسلم (ذمی) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ـــــ اخزک اللہ، خدا تجھے ذلیل کرے! سہواً یہ الفاظ تو زبان سے نکل گئے، اس کے بعد اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ بابِ خلافت میں آکر استعفےٰ دے دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ جو احترامِ آدمیت نہیں کر سکتا وہ خود بھی کسی عزت و احترام کا مستحق نہیں۔

یہ تھے وہ حکمران جو نہ گداگر تھے، نہ قزاق۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

اور یہ تھی وہ مملکت جو اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی کہ ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

وہ جانتے تھے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں، اور شریعتِ حقہ کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔

(۰)

عزیزانِ من! وقت تھوڑا ہے اور داستان دراز۔ اس لئے مجھے اختصار سے کام لینا ہے۔

ابھی تک ہم محنت کشوں کی محتاجی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کا اگلا گوشہ، مالکانِ زمین اور مزارعین کی کشمکش ہے۔ اس باب میں قرآنِ مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ زمین، تمام نوعِ انسان (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سرچشمۂ رزق ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اور جب کوئی شخص زمین کا مالک نہیں ہو سکتا تو، مالکِ اراضی اور مزارع کی کشمکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں بھی اس موضوع پر بڑی تفصیل سے آیا ہے اور علامہ اقبالؒ نے بھی اس پر شرح و بسط سے لکھا ہے۔ (تفصیل اس کی میری کتاب، نظامِ ربوبیت میں ملے گی) میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورۂ واقعہ کی چند آیات میں قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

> تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کے مطابق۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ہوتا ہے۔ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝ (۵۶/۶۳-۶۴)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں، خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے: أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ (۵۶/۶۸-۶۹)

اس کے بعد کہا کہ ... تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں مستور کر دینا، تمہاری کاریگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝ (۵۶/۷۱-۷۲)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر! تم کسی نہج سے بھی غور کرو۔ بہرحال، اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا، اس ماحصل میں تمہارا حصہ صرف تمہاری

محنت کے بقدر ہو سکتا ہے ۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے ۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو ۔ اور ہمارا حصہ ... یہاں سے دو سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ تک کیسے پہنچایئں ، جواب دیا : مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۵۶/۷۳﴾ یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں ۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا ۔

علامہ اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بالِ جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے :-

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ !

اور نظم یہ ہے :-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ! | کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟ | خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟ | موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

دِہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں !
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں ! (بالِ جبریل صفحہ ۱۶۱)

جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی تو کسی مزارع کو زمین ، بٹائی یا پٹہ پر دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ ابوداؤدؒ میں حضرت ابن ابی نعیم کی روایت ہے کہ

> رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی ۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا ۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی ؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے ۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو ۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچ اس سے وصول کر لو ۔ (شاہکارِ رسالت ۔ صفحہ ۳۸۴)

جب زمین پر کسی کی ملکیت ہی جائز نہیں ، تو کوئی شخص نہ زمیندار ہو سکتا ہے ، نہ اس کا کوئی مزارع ۔ لہٰذا نہ وہ اس کا محتاج ہوگا ، نہ ڈھیل ۔ کس نگردد در جہاں محتاجِ کس ۔

(٥)

اور آخر میں ہمارے سامنے وہ گوشہ آتا ہے جو ان تمام خباثت اور مفاسد کی جڑ اور بنیاد ہے ۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری ! قرآنِ کریم نے معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۵۳/۳۹﴾ معاوضہ صرف محنت کا ہے ۔ اس کے برعکس ، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ معاوضہ سرمایہ کا ہے ۔ یعنی ایک شخص سرمایہ لگاتا ہے ، اور دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں ، خواہ اس کی شکل انڈسٹری (کارخانہ داری) کی ہو ، اور خواہ کامرس (تجارت) کی ۔ یہ شخص ان محنت کشوں کی محنت کے ماحصل میں سے معتدبہ حصہ لے جاتا ہے اور اسے اپنے سرمایہ کا معاوضہ کہتا ہے ۔ قرآنِ کریم اسے ربٰو کہہ کر پکارتا ہے ، اور نہ صرف اسے حرام کہتا ہے بلکہ اسلامی مملکت کے خلاف

بغاوت قرار دیتا ہے۔ سرمایہ، دولت جمع کرنے کا نام ہے اور قرآنِ کریم دولت جمع کرنے کو جرمِ عظیم اور عذابِ جہنم کا مستوجب ٹھہراتا ہے۔ قرآنِ مجید کی بکثرت آیات اسی موضوع پر ہیں۔ میں اس وقت صرف ایک آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے (یہ عذاب اس دن واقعہ ہوگا) جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں۔ پہلوؤں اور پیٹھ کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا، سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، قرآنِ مجید میں اکتنازِ دولت کے خلاف اس قدر آیات ہیں کہ ان کی روشنی میں اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی کہ قرآنِ کریم نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اگرچہ مجھے اس کے بعد عنانِ گفتگو اقبالؒ کی طرف موڑ دینی چاہیئے لیکن یہاں ایک ایسا سوال میرے سامنے آتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے دل میں بھی ابھر رہا ہوگا، جس سے صرفِ نظر کر کے آگے بڑھا نہیں جا سکتا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ دولت جمع کرنے کے دیگر عنوانات کو چھوڑیئے، زکوٰۃ کو اسلام کا ایک ستون قرار دیا جاتا ہے۔ اور زکوٰۃ بہرحال جمع شدہ دولت پر ہی ادا کی جاتی ہے۔ اگر اسلام میں دولت جمع کرنا اس قدر ممنوع ہے تو پھر زکوٰۃ ادا کرنے کا سوال کس طرح پیدا ہوگا۔ میں سردست اس موضوع کی طرف نہیں آنا چاہتا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے، اور اس مفہوم کی رُو سے اکتنازِ دولت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ، آیہ زیرِ نظر کی موجودگی میں زکوٰۃ کس طرح فرض ہوئی؟ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ

(حضرت) ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ...) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

ط خدا کا حکم۔ رسول اللہؐ کی زبانِ مبارک سے، اور صحابہؓ پر گراں گذرے! (معاذ اللہ)

خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے..... ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سُن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا.....

(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

اس سے واضح ہے کہ ہماری مروجہ زکوٰۃ (یعنی جمع شدہ مال پر۔ مال کے بعد، اڑھائی فی صد دے دینا) قرآن نے فرض نہیں قرار دیا۔ وضعی روایات کی رُو سے ایسا ہوا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ نظامِ سرمایہ داری جسے ختم کرنے کے لئے اسلام آیا تھا، عین مطابقِ اسلام قرار پا گیا۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی کتاب مسئلہ ملکیتِ زمین، میں لکھتے ہیں:۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور ملکیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی..... جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء۔ مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ (پہلا ایڈیشن صفحہ ۵۲) پھر جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ۔ اتنے مکان اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو..... نیز وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔ اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے حقوقِ ملکیت ہی حاصل نہیں۔ (صفحہ ۵۳)

اس سے نظامِ سرمایہ داری کے دروازے چوپٹ کھل گئے اور مزارعت (بٹائی یا پٹہ پر زمین کاشت کرانا) اور مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP) سب جائز قرار پا گئے۔ اقبالؒ نے اس کے خلاف مسلسل جہاد جاری رکھا۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ قرآن کریم نے اس کا راستہ ہی بند کر دیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے: یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط..... "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں؟... قُلِ الْعَفْوَ ط..." (۲/۲۱۹) فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے، وہ سب!

ہماری ملوکیت نے ان.... آیات کو یا تو منسوخ قرار دے رکھا تھا اور یا محض تلاوت کے لئے برقرار۔ ان کا حکم بہرحال منسوخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس اُمّت میں بھی نظامِ سرمایہ داری رائج رہا اور باقی دنیا بھی قرآنی نظام کی برکات سے محروم رہی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اگر کوئی جماعت، قرآنی نظام کو قائم کرنے کے لئے نہیں اٹھتی، تو کائناتی قوتیں یا زمانے کے تقاضے، انسانوں کو اس کی طرف آنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ روس کا انقلاب انہی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس میں فاضلہ دولت کے نظریہ کو شدت سے مسترد

کیا گیا تھا۔ اقبالؒ نے اسی کے پیشِ نظر کہا تھا کہ :ـــــ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم　　　بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر　　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!　　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

ربوٰ

ہمارے ہاں آجکل معاشرہ کے ہر جزو اور کُل کو "مسلمان کرنے" کا جنون اعصاب پر سوار ہے۔ معاشیات اس کا خاص طور پر ہدف ہے۔ اس سلسلہ میں سُود کے مسئلہ پر بڑی طول و طویل بحثیں ہو رہی ہیں۔ پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل تصانیف شائع ہوتی ہیں۔ یہ کچھ اس مسئلہ کے متعلق ہو رہا ہے جسے قرآنِ کریم نے دو لفظوں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی نظام قائم ہونے سے پہلے، عربی معاشرہ میں ربوٰ کا کاروبار عام تھا۔ جب قرآنِ مجید نے ربوٰ کو حرام قرار دیا اور مملکت کے خلاف بغاوت، تو سابقہ کاروبار کے سلسلہ میں فرمایا: فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۔۔۔۔ تم صرف اپنا اصل زر لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ٥ (۲/۲۷۹) اس سے نہ تو تم پر کوئی زیادتی ہوگی کہ نہیں تمہارا پیسہ واپس مل جائے گا۔ اس میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔ اور فریقِ مقابل پر بھی کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی کہ اسے اصل سے کچھ زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔ قرآن مجید کے ان چار لفظوں نے ساری بات واضح کر دی۔ جو کچھ رأس المال (اصل زر) سے زیادہ لیا جائے گا، وہ ربوٰ ہوگا، خواہ اس کی شکل نقدی قرضہ کی ہو۔ مزارعت کی ہو۔ مضاربت کی ہو۔ بینک کی ۔۔۔۔۔۔ اصطلاح "شرکتِ منافع" کی ہو۔ سب ربوٰ کے زمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ سُود پر پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل تصانیف میں، قرآن کریم کی اس آیت کو کبھی سامنے نہیں لایا جائے گا۔ جو کچھ لکھا جائے گا وہ اس حقیقت کا غماز ہوگا کہ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

یہ تو تھا سابقہ سودی کاروبار کے متعلق حکم۔ اسلامی نظامِ معیشت میں "قُلِ الْعَفْوَ" نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوگی، نہ اس پر کچھ زائد لینے کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ ہی کسی کو کسی سے کچھ مانگ کر ذلیل ہونے کی ضرورت پڑے گی۔ اسلامی نظام ہر ایک کی ضروریات بطور اس کے حق کے پوری کرے گا۔

انقلابِ روس کے دعاوی میں اقبالؒ کو اسی "قُلِ الْعَفْوَ" کی جھلک دکھائی دی تھی جس سے اس کی خوش نظری نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے　　　نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے　　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا!

(ضمناً) "مداری" کا لفظ یوں تو (بظاہر) "سرمایہ داری" کے قافیہ کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس میں ایک معنوی نکتہ بھی ہے۔ اب تو اس قسم کے مداری نہیں آتے۔ کچھ عرصہ پہلے جو مداری آتے تھے، وہ خالی ہاتھوں روپے پر روپیہ بناتے چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ روپیہ درحقیقت بنتا نہیں تھا۔ بظاہر ایسا آتا تھا کہ روپیہ بن رہا ہے۔ یہی کیفیت نظامِ سرمایہ داری کی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے: لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص..... (۳/۱۳۰) سمجھا یہ جاتا ہے کہ ربوٰ سے دولت بڑھتی ہے، یہ صحیح نہیں۔ اس سے قومی دولت بڑھتی نہیں، گھٹتی ہے۔ یہ جو دولت بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے، مداری کا "ہنخ نامک" ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی نظم میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے!

حالانکہ یہ ۱۹۳۴-۳۵ء کی بات ہے، جب ہنوز خود چینیوں کو بھی اس کا احساس نہیں تھا کہ ان کی شبِ تیرہ و تار کی سحر قریب ہے۔ لیکن قرآنی بصیرت کی روشنی میں حال کے واقعات، حوادث کے تجزیہ سے مستقبل کے متعلق اس قسم کی قیاس آرائی مشکل نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہ روس اور چین کی بات تھی۔ کہتے ہیں کہ مور جنگل میں ناچتا ہے تو اپنے رقص کی نازک خرامیوں اور اپنے رنگین پروں کی جلوہ پاشیوں میں وہ ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے ماحول تو ایک طرف، خود اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ لیکن اس کے بعد جب اس کی نگاہ اپنے پاؤں پر پڑتی ہے تو رقص ختم ہو جاتا ہے۔ پر سمٹ جاتے ہیں۔ اور وہ نہایت پژمردگی کے عالم میں نگوں سار ہو جاتا ہے۔

حضرتِ علامہؒ ــــ زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے ــــ کی وجد آفرینیوں میں محو تھے کہ ان کی نگاہ ملتِ اسلامیہ پر پڑی۔ کیف و مستی کا وہ عالم، رقصِ طاؤس کی طرح مرجھا گیا۔ اور انتہائی سوز و گداز سے پکار اُٹھے کہ ؎

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش!
تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی! یہ اُمّت روایات میں کھو گئی!
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اُس کا منطق سے سلجھا ہوا اُمّت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا! یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے! (بالِ جبریل صفحہ ۱۶۸)

مشیرانِ ابلیس کی زبان میں :-

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام!
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طوافِ حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام (ارمغانِ حجاز)

اور خود ابلیس کے الفاظ میں :-

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں (")

ایسے یاس انگیز حالات میں بڑے بڑے اربابِ عزم کے سینوں میں بھی امید کی کرن بجھ کر رہ جاتی ہے، لیکن اقبالؒ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا ایمان اور پیغام یہ تھا کہ :-

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

وہ قوم کے بڑے بوڑھوں سے ناامید ہوا تو اپنی توجہ کا مرکز آنے والی نسل کے نوجوانوں کو قرار دے دیا۔ وہ خدا سے پورے عجز و الحاح کے ساتھ دعائیں مانگتے تھے کہ :-

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن! — دارم اندر دل سخنے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا — بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اور :-

جوانوں کو میری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور بالِ جبریل (کے ساقی نامہ) کی اسی نظم میں، جو ابھی فردوسِ گوش بن رہی تھی، کہا کہ :-

خرد کو غلامی سے آزاد کر! — جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت حالات اس زمانے سے بھی کہیں زیادہ مایوس کن ہیں، جب علامہؒ، پیرانِ کہن سے ناامید ہوئے تھے، لیکن میں ان کی یاد میں اس تقریب کو افسردہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کا اختتام ان کی اس دعا پر کرنا چاہتا ہوں جو ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھری تھی۔ یعنی :-

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر! — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں! — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں!
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز! — مری خلوت و انجمن کا گداز!

امنگیں مری، آرزوئیں مری! امیدیں مری، جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے! اٹھ کانے لگا دے اسے!
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۰)

ایک سوال

میرا خطاب تو ختم ہوا، لیکن ایک سوال ہے جو مجھ سے ایک عرصہ سے پوچھا جا رہا ہے، اور میں اسے اب تک ٹالتا چلا آیا ہوں۔ لیکن اب اس کے تقاضے اس قدر شدید ہو گئے ہیں کہ مجھے (بادلِ ناخواستہ) اسے سامنے لانا پڑ رہا ہے۔ سوال کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ "ہم برسوں سے آپ کے درس میں بھی اور دیگر تقاریب میں بھی آپ کی زبانی پیغام اقبالؒ سنتے چلے آ رہے ہیں، اور آپ کی تحریروں میں پڑھتے بھی ہیں۔ آپ کو جس قدر اقبالؒ پر عبور ہے اور اسے آپ جس انداز سے قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ملک میں علامہ اقبالؒ سے متعلق اتنی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ آپ ان میں کیوں شریک نہیں ہوتے تاکہ اس پیغام کا دائرہ وسیع ہو؟"

جواب:۔ اس سوال کا دو لفظوں میں جواب یہ ہے کہ ان تقاریب میں وہی شریک ہو سکتا ہے جسے شرکت کی دعوت دی جائے۔ مجھے دعوت نہیں دی جاتی..... اس لئے میں ان میں شریک نہیں ہوتا۔

لیکن اس پر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو دعوت کیوں نہیں دیتے؟ اس کا پھر دو لفظی جواب یہ ہے کہ یہ ان حضرات سے پوچھئے کہ وہ مجھے دعوت کیوں نہیں دیتے؟ لیکن چونکہ اس سے بھی مستفسرین کا اطمینان نہیں ہوگا اس لئے جو کچھ میں سمجھتا ہوں اسے عرضِ خدمت کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ حضرات مجھے اس لئے نہیں بلاتے کہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآنِ کریم پیش کرتا ہوں (خواہ اس کا واسطہ کلامِ اقبالؒ ہو یا پیغامِ قائدِ اعظمؒ) اور قرآن ہماری قوم کے مزاج کے موافق نہیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس کی آواز عام نہ ہونے پائے۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے ہاں اپنے ذرائع ابلاغ موجود ہیں۔ لیکن اس سے جس طرح قوم اقبالؒ کی قرآنی فکر سے محروم رہ جاتی ہے اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اقبال سے متعلق تقاریب ہوں یا قائدِ اعظمؒ سے متعلق، انہیں محض رسمی طور پر منایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی اس وقت تک کیا جائے گا جب تک اس سے کچھ مفاد حاصل ہوتے ہوں۔ اس کے بعد فقط تاریخ کی کتابوں میں ان کے نام رہ جائیں گے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ داتا گنج بخش (علیہ الرحمۃ) کا عرس تو اس قدر دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضؓ یا حضرت عمر فاروق رضؓ کے متعلق اتنا بھی بہت

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ وفات (یا شہادت) کونسی ہے! دو ایک سال اُدھر سے، یومِ صدیق رضؓ اور یومِ فاروق رضؓ کی آوازیں تو سنائی دینے لگی ہیں لیکن بڑی مدھم سی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ داتا صاحب (علیہ الرحمۃ) کی تقاریب کے سلسلہ میں لاکھوں روپے کی یافت ہوتی ہے اور صدیق اکبرؓ اور عمر فاروق رضؓ کی یاد منانے میں (کچھ ملنا تو ایک طرف) گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے یا چندہ جمع کرنا۔ اگر اقبالؒ کی تقاریب کے سلسلہ میں بھی یہ صورت پیدا ہوگئی تو اس کی آواز صرف قوالوں کی ڈھولک کی تھاپ پر سنائی دیا کرے گی کہ "طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون ہے"۔

ہماری قوم کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ ——— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں ——— اور قرآنِ کریم کو تلاوت تک، اور اقبالؒ کو شاعری تک محدود (بلکہ محبوس) رکھنے سے بھی مقصد یہی ہے۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ قوم کی اسی ذہنیت کے پیشِ نظر، علامہؒ نے کہا تھا کہ ؎

اقبالؒ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا! | موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے | پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات!

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں آخری ریزولیشن یہ پاس ہوا تھا کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے | پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبالؒ سے متعلق تقاریب بھی اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اس نے سچ کہا تھا کہ ؎

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی | میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نَے نوازی!

یہ اس لئے کہ ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں | اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی!

نتیجہ اس کا یہ کہ ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے | کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی!

اور، یہ

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

والسلام

ضرورتِ رشتہ:۔ ایک پاکستانی مسلم گھرانے کے لئے مندرجہ ذیل رشتوں کی ضرورت ہے:۔

(۱) ۲۸ سالہ نیک سیرت نوجوان کے لئے جو بی ایس سی کیمیکل انجینئرنگ (BSc Eng) اور ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن (M.BA) دونوں کوالیفکیشنوں کا حامل اور برسرِ روزگار ہے، ایک دوشیزہ لیڈی ڈاکٹر (یا طالبہ آخری سال M.B.B.S) کا رشتہ درکار ہے۔

(۲) ۱۹ سالہ خوش شکل دوشیزہ کے لئے جو میٹرک پاس ہے اور گھریلو امور میں ماہر بھی۔ موزوں نوجوان کا رشتہ درکار ہے جو (ترجیحاً) بزنس مین ہو یا کسی اچھے عہدہ پر فائز۔ (خط و کتابت بصیغۂ راز)

د۔ خ۔ ر (معرفت) ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

ادارۂ طلوعِ اسلام کی
مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ:۔ اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (کھلے پارے)	روپے
پارہ نمبر ۱	-/۶
پارہ نمبر ۲ تا ۲۸	-/۴ (فی پارہ)
پارہ نمبر ۲۹	-/۵
پارہ نمبر ۳۰	-/۶
مکمل سیٹ (کھلے پارے)	-/۱۲۵
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ) (مجلد تین جلدوں میں)	-/۱۵۰ فی جلد -/۵۰
لغات القرآن (مکمل سیٹ) (مجلد چار جلدوں میں)	-/۱۵۰ فی جلد -/۴۰
تبویب القرآن (مکمل سیٹ)	-/۱۷۵
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	-/۵۰
مطالب الفرقان (جلد دوم)	-/۵۰
مطالب الفرقان (جلد سوم)	-/۷۵
نظامِ ربوبیت (جدید ایڈیشن)	-/۵۰
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	-/۲۰
ابلیس و آدم	-/۳۵
جوئے نور	-/۳۰
شعلۂ مستور	-/۳۰

نام کتاب	قیمت
جہانِ فردا	-/۳۰
کتاب التقدیر	-/۳۵
معراجِ انسانیت	-/۵۰
اقبالؒ اور قرآن	-/۳۰
انسان نے کیا سوچا؟	-/۴۰
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	-/۱۲
اسبابِ زوالِ اُمّت	-/۵
قائدِاعظمؒ اور طلوعِ اسلام	-/۴
ISLAM A CHALLENGE -- TO RELIGION (H.B)	-/۵۰
ISLAM A CHALLENGE -- TO RELIGION (P.B)	-/۴۰
سلسبیل	-/۱۵
فردوسِ گم گشتہ	-/۱۵
ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	-/۱۵
سلیم کے نام خطوط (جلد دوم و سوم)	-/۱۵ فی جلد
طاہرؒ کے نام خطوط	-/۱۰
مقامِ حدیث	-/۱۰

نام کتاب	قیمت
اسلامی معاشرت	-/۶ روپے
قرآنی فیصلے (مکمل ۴ جلدیں)	-/۴۵
(پہلی تین جلدیں، ہر جلد -/۱۰ روپے)	
جہاد	-/۵
عربی خود سیکھئے	-/۱۰
پاکستان کا معمارِ اوّل	-/۵
فجرِ الاسلام (مکمل دو جلدیں - فی جلد -/۸)	-/۱۵
منزل بہ منزل	-/۱۵
پرنسپل آف لامیکنگ ان اسلام (انگریزی)	-/۵

نام کتاب	قیمت
قتلِ مرتد	-/۵ روپے
تاریخ الامّت (مکمل سیٹ ۸ جلدیں)	-/۴۰ / فی جلد -/۵
تصنیفات (انگریزی) ڈاکٹر عبدالودود صاحب:-	
PHENOMENA OF -- NATURE & QURAN (H.R)	-/۵۰
CONSPIRACIES -- AGAINST QURAN (H.B)	-/۴۰
FOOD & HYGIENE -- IN ISLAM (R.B)	-/۸

کتابیں ملنے کے پتے:-

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور

یا

(۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار - لاہور

ماہنامہ طلوعِ اِسلام کا سالانہ چندہ

اندرونِ ملک (پاکستان) ---------- -/۳۶ روپے
غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک رجسٹرڈ ---------- -/۸۰ روپے
غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک رجسٹرڈ برائے:-

۱- برطانیہ - فرانس - سوئٹزرلینڈ وغیرہ -/۱۳۰ روپے
۲- دوبئی - بحرین - کویت - سعودی عرب وغیرہ -/۱۱۰ "
۳- لیبیا - کینیا - یوگنڈا - جنوبی افریقہ ---/۱۲۵ "
۴- امریکہ - کینیڈا وغیرہ ---/۱۹۰ روپے
۵- نیوزی لینڈ و آسٹریلیا ---/۱۷۵ "
۶- انڈیا وغیرہ ---------- -/۱۱۵ "

(طلوعِ اسلام کے متعلق صرف ادارہ طلوعِ اسلام کو لکھیئے) (ناظمِ ادارہ)

بات آگے کیوں نہیں بڑھتی؟

آج کل ہمارا معاشرہ جس قسم کے خلفشار کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی مثال کم ملے گی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تھوڑے سے غور و تدبر کے بعد سمجھ میں آجائیگی۔ معاشرہ میں جو خاص الفاظ یا اصطلاحات بالعموم استعمال ہوتی ہیں، اگر ان کے معانی اور مفہوم متعین ہوں تو ذہنی انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ الفاظ اور اصطلاحات تو بارش کی طرح برس رہے ہوں اور ان کے نہ معانی متعین ہوں نہ مفہوم، تو انتشار جھگڑے اور دنگوں کی شکل اختیار کرے گا، اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ قوم بھنور میں گھری ہوئی لکڑی کی طرح مسلسل حرکت میں دکھائی دے گی لیکن آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھے گی۔

مثال کے طور پر ان چند ایک الفاظ اور اصطلاحات پر غور کیجئے جو ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر ہیں اور سوچئے کہ کیا ان کا کوئی متفق علیہ متعین مفہوم بھی ہمارے ذہن میں ہے؟

۱۔ اسلام

آجکل سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ، یا اصطلاح اسلام ہے۔ وہ کون سا عقیدہ، نظریہ، مسلک، نظام، پروگرام ہے جس کے ساتھ "اسلامی" کا لاحقہ نہیں لگا دیا جاتا۔ لیکن آپ "اسلامی" کہنے والے کسی دو (عوام اتنا نہیں) خواص سے پوچھ کر دیکھئے۔ یا تو اس کا کوئی متعین مفہوم ہی ان کے ذہن میں نہیں ہوگا، اور یا ان کا مفہوم ایک دوسرے سے نہیں ملے گا۔ ان کے پیش نظر کوئی ایسا معیار ہی نہیں ہوگا جس سے اسلامی اور غیر اسلامی میں پرکھ یا تمیز ہو سکے۔ جب ان دو کی یہ کیفیت ہے، تو سات کروڑ میں جو ذہنی تشتت ہوگا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اپنے اس بنیادی سقم کو چھپانے کے لئے ایک اور اصطلاح عام کر رکھی ہے۔ یعنی

۲۔ کتاب و سنّت

کتاب تو ایک متعین کتاب ہے۔ یعنی قرآن مجید۔ لیکن سنّت کی اصطلاح جس قدر مقدس ہے اتنا ہی اس کا مفہوم غیر متعین ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ہر حدیث سنّت ہے لیکن دوسروں کے نزدیک سنت سے مراد حضورؐ کے صرف وہ اعمال ہیں جو آپؐ نے بہ حیثیت رسول اللہ انجام دیئے تھے (سنّت کی یہ تعریف مودودی مرحوم کی ہے)۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتّٰی کہ بخاریؔ اور مسلمؔ کا مجموعہ بھی نہیں۔ سنّت کے متعلق دشواری اس سے بھی زیادہ ہے۔ حدیث کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جس میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہو کہ حضورؐ نے فلاں کام

بحیثیت رسول التزاماً گیا تھا اور فلاں کام شہری حیثیت سے۔ لہٰذا سنت کا بھی کوئی متفق علیہ مجموعہ امت کے پاس نہیں، مودودی مرحوم نے کہا تھا کہ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسول کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے اور جماعت اہل حدیث کے امیر (مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم) نے ایسے دعویٰ کو باطل قرار دیا تھا۔

کتاب و سنت کی اصطلاح میں یہ بھی طے نہیں کہ ان دونوں کا باہمی تعلق کیا ہے؟ نظری طور پر تو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی حیثیت بہرحال فائق ہے لیکن عملاً حدیث کو قرآن پر قاضی قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی جب کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں ٹکراؤ ہو، تو فیصلہ حدیث کے مطابق ہوگا۔ بعض اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

پاکستان میں اسلامی قوانین سازی کی بنیادی ذمہ داری اسلامی نظریاتی کونسل کی ہے اور اس کے بعد مرکزی حکومت کے شعبہ (یا وزارت) قانون (LAW MINISTRY) کی۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ نہ نظریاتی کونسل کے پاس اور نہ ہی وزارتِ قانون کے پاس "سنت" کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتیٰ کہ وفاقی شرعی عدالت یا سپریم کورٹ کے پاس بھی نہیں۔ اس کے باوجود ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ یہ تمام امور کے فیصلے "کتاب و سنت" کے مطابق کریں؟ یہ بات تعجب انگیز ہے یا نہیں؟

اس کا حل انہوں نے یہ تلاش کیا ہے کہ۔

۳۔ فقہ کے قوانین

نافذ کر دیئے جائیں۔ ہمارے مختلف فرقوں کی مختلف فقہیں ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ اپنی فقہ کو کتاب و سنت کے مطابق قرار دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اس کا مطلب یہ ہے کہ "کتاب و سنت" ایک ایسا مرچشمہ ہے جہاں سے ایسے قوانین مل سکتے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہوں۔ اہل حدیث حضرات، سرے سے کسی فقہ کے ہی قائل نہیں۔

یہ ہیں وہ حقائق جن سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے۔ ان قوانین کا حشر کیا ہوگا اس کی مثالیں ابھی سے ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ مرکزی حکومت (زکوٰۃ سے متعلق) ایک پبلک لا نافذ کرتی ہے۔ اس کے خلاف احتجاج ہوتا ہے تو قانون کو تبدیل کر کے کہدیا جاتا ہے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس فریضہ کو ادا کرے۔ ان میں سے ہر ایک کا عمل اسلامی تسلیم کر لیا جائے گا۔

یا مثلاً مرکزی حکومت، نظریاتی کونسل اور وزارتِ قانون کی تصویب کے بعد سزا کا ایک قانون (رجم) نافذ کرتی ہے۔ اسی حکومت کی وفاقی شرعی عدالت اس قانون کو اسلام کے منافی قرار دے دیتی ہے۔ . . . . . اور ارادہ رکھتی ہے کہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دے۔ اب معلوم نہیں سپریم کورٹ کس کے فیصلے کو "کتاب و سنت" کے مطابق قرار دے!

اس خلفشار کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ کسی نے "اسلامی" یا غیر اسلامی ہونے کا معیار یا "کتاب و سنت" کا متفقہ مفہوم متعین نہیں کیا، نہ ہی کسی ایسے ضابطہ کی نشاندہی کی ہے جس میں یہ معیار متفق علیہ طور پر موجود و محفوظ ہو۔ جن قوانین کے متعلق یہ کچھ ہو رہا ہے ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کی خلاف ورزی سے دنیاوی عدالتوں کی طرف سے سزا تو ملے گی ہی، انہیں خدا و رسول کے احکام قرار دیا جاتا ہے اس لئے ان کی معصیت سے آخرت میں بھی سزائے جہنم ملے گی۔ سوچئے کہ جن قوانین کا تعلق امت کے ایمان اور آخرت

کی زندگی سے ہو، کیا ان کی کیفیت ایسی ہی ہونی چاہئے؟
اسلامی قوانین سے آگے بڑھئے تو

نظریۂ پاکستان

کی باری آتی ہے۔ تشکیلِ پاکستان سے لے کر آج تک جتنی بار اس اصطلاح کو دہرایا گیا ہے اس کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے۔ لیکن کیا آپ نے کسی کی زبان سے آج تک سُنا ہے کہ یہ نظریہ ہے کیا اور اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ پہلے تو یہ ایک نظری سوال تھا لیکن اب کہا جاتا ہے کہ اس نظریہ کی مخالفت کرنے والوں کو مملکت کا غدار تصوّر کیا جائے گا۔ یہ بجا ہے۔ اسے ایسا ہی تصوّر کیا جانا چاہیئے۔ لیکن کیا یہ ضروری نہیں کہ پہلے یہ بتایا جائے کہ نظریۂ پاکستان ہے کیا؟ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ کسی نے اس کی مخالفت کی ہے یا نہیں؟ یہ تو قانون کا ابتدائی تقاضا ہے جس کا پورا کیا جانا نہایت ضروری ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو ملّتِ پاکستانیہ کے سامنے ہیں اور ان کے موجود ہونے سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ نظریۂ پاکستان کے سوا ان سب کا تعلق براہِ راست ہماری مذہبی پیشوائیت سے ہے۔ ان کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں، لیکن اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے وہ ٹیکنیک یہ اختیار کرتے ہیں کہ جونہی کسی نے اس قسم کا کوئی سوال اُٹھایا، شور مچا دیا کہ یہ ملحد ہیں۔ بے دین ہیں۔ منکرینِ حدیث ہیں۔ مغرب زدہ ہیں۔ سیکولرازم کے حامی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ نعرے اس زور و شور سے بلند کئے کہ وہ سوال اس شور میں دب کر رہ گیا اور یہ حضرات مطمئن ہو گئے کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔

سوال یہ نہیں کہ ایسا کہنے والے کیا ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا جانا ضروری نہیں؟ کیا یہ بتانا ضروری نہیں کہ:

۱۔ کسی عقیدہ۔ نظریہ۔ مسلک یا قانون کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا متعین یا متفق علیہ معیار کیا ہے؟

۲۔ کیا اس کی وضاحت ضروری نہیں کہ سنتِ نبوی (علیہ التحیۃ والسلام) کا متعین مفہوم کیا ہے، اور وہ کونسی کتاب ہے جس میں یہ سنت اس طرح محفوظ ہے کہ اسے سب سنت تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ کیا یہ متفقہ طور پر طے کرنا ضروری نہیں کہ فقہی قوانین کی اپنی حیثیت کیا ہے، اور آیا یہ ضروری ہے یا نہیں کہ شق (۱) کے مطابق انہیں بھی پرکھ کر دیکھ لیا جائے کہ وہ اسلامی ہونے کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟

مذہبی پیشوائیت سے قطع نظر، ہم ملک کے ارباب دانش و بینش اور پاکستان کے بہی خواہ طبقہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک ان امور کا متعین طور پر طے پا جانا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر وہ اسے ضروری سمجھتے ہیں تو کیا ان پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا کہ وہ آئینی اور قانونی طور پر اس کا مطالبہ کریں؟ اس وقت تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ملک میں قانون سازی کے معاملہ کو محض جذباتی طور پر ہاتھ میں لے لیا گیا ہے اور ان مباحات تک کو حقائق کی روشنی میں طے ہی نہیں کیا گیا جو اس باب میں شرطِ اوّل اور لابنفک تقاضا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ قانون، قانون ہی نہیں کہلا سکتا جس کے مبادیات، تضمنات، حدود اور شرائط کو (DEFINE) اور متعین نہ کیا جائے۔

اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ڈر ہے کہ موجودہ ذہنی خلفشار اور فکری انتشار، مملکت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دے گا۔ قوم کا نوجوان

طبقہ اس صورت حال سے بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

جو بھی مذہب سے برگشتہ ...... ہو، کمیونزم لپک کر اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ آپ اقوامِ مغرب کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہاں سیکولرازم (جس میں مغربی نظامِ جمہوریت اور اشتراکیت دونوں شامل ہیں) لائی ہوئی ہی تھیاکریسی کی ہے۔ وہی تھیاکریسی اب یہاں بھی عام ہو رہی ہے۔ تو اس کا جو نتیجہ وہاں برآمد ہوا تھا وہی یہاں بھی برآمد نہیں ہو گا؟ تھیاکریسی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن قوانین کو مذہبی پیشوائیت، خدا کے احکام کہدے، انہیں جانچے، پرکھے بغیر، خدا کے احکام تسلیم کر کے ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ نبی اکرمؐ نے اسے شرک قرار دیا۔ موسّسِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے اس سے محترز رہنے کی تاکید کی۔ اور معمارِ پاکستان نے کھلے الفاظ میں کہدیا کہ پاکستان میں ایسا نظام نافذ نہیں ہو گا۔ اس کے تخریبی نتائج ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس خطۂ ارض کو اس تباہی سے محفوظ رکھے۔

تھیاکریسی میں ہوتا کیا ہے، اس کے لئے آپ روزنامہ نوائے وقت بابت ۱۰ رمئی سنہ ۱۹۸۱ء کے اداریہ میں مندرجِ ذیل خبر ملاحظہ فرمائیے:۔

> صدر بنی صدر نے بھی ایک انٹرویو میں جو فرانس کے ایک اخبار میں شائع ہوا ہے، یہ کہا ہے کہ —— "ہمارے ملک میں تشدّد ایک مرتبہ پھر معمول بن کر رہ گیا ہے۔ انقلاب کے زمانے میں جب ہم اسلامی حکومت کی بات کرتے تھے، تو اس سے مراد قانون کی حکومت ہوتی تھی، لیکن اب کوئی قانون باقی نہیں رہا، اور لوگوں کو ماضی کی طرح ہی گرفتار اور تشدّد کا نشانہ بنایا جاتا ہے" انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ تشدّد کا نشانہ بننے والے ۵۰۰ سے زائد معاملات کی دستاویزات ان کی اپنی تحویل میں ہیں اور جناب خمینی نے تشدّد کی شکایات اور واقعات کے متعلق جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تھا، اس کے ایک رکن کے بیان کے مطابق کمیشن کے پاس ۲۰۰ ۲ ۳ دستاویزات جمع ہو چکی ہیں۔

ہمیں ان واقعات پر نہ کوئی تعجب ہوا ہے نہ حیرت۔ اس لئے کہ یہ خلافِ توقع نہیں۔ تھیاکریسی کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ تاریخِ انسانیت اس کی شاہد ہے۔ ہمیں اس سے افسوس ضرور ہوا ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا میں اسلام کہیں بھی نافذ العمل نہیں، اس لئے ہمیں کسی انقلاب، کسی نظام، کسی قانون کو اسلامی نہیں کہنا چاہئے تاوقتیکہ وہ قرآن مجید کی کسوٹی پر پورا نہ اترے۔ ایسا کئے بغیر جب آپ کسی مملکت یا حکومت کو اسلامی کہتے ہیں تو اس سے اسلام دنیا میں بدنام ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے نہایت دکھے ہوئے دل کے ساتھ کہا تھا کہ

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو از درود خود میالا نامِ او

جب تک تو اسوۂ محمدیہ کو اپنی سیرت میں منعکس نہ کر لے، حضورؐ پر درود مت بھیج، کیونکہ اس طرح "تیرے درود سے حضورؐ کا نامِ نامی آلودہ ہو جاتا ہے"۔ ہمارا قلب اگر حساس ہو تو ہمیں تو حضورؐ کی طرف اپنی نسبت کرتے ہوئے بھی شرم آنی چاہئیے۔ اسلام کو جس قدر بدنام ہم نے کیا ہے، اسلام کے دشمنوں نے بھی ایسا نہیں کیا تھا۔

زگلفروشی نالم کہ اہلِ بازار است تپاک گرمیٔ رفتارِ باغبانم سوخت

* * *

حقائق و عبر

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

تحریک پاکستان کو اتنا نقصان ہندو اور انگریز نے مل کر بھی نہیں پہنچایا تھا جتنا نیشنلسٹ علماء نے پہنچایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا تو اس بنا پر کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے، اور قائداعظمؒ نے اس تصور کو عمل میں لانے کے لئے قدم اٹھایا تو وہ بھی یہ کہہ کر کہ یہ مطالبہ دینی ہے۔ ہندو، انگریز اور نیشنلسٹ (سیاسی) مسلمان لیڈروں نے اس کی مخالفت سیاسی وجوہ کی بنا پر کی لیکن نیشنلسٹ علماء نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ یہ مطالبہ اسلام کے خلاف ہے۔ چونکہ ہمارے عوام کے نزدیک، مذہبی امور میں سند، علماء کرام تھے نہ کہ اقبالؒ اور جناحؒ، اس لئے ان کا علماء کے زیر اثر آجانا (یا رہنا) فطری امر تھا۔ تحریک پاکستان کے مؤیدان کا بیشتر وقت اور توانائی انہی حضرات کے اعتراضات کا جواب دینے میں صرف ہو جاتے تھے۔ طلوع اسلام کی یہ شنید نہیں، دید (بلکہ آپ بیتی) ہے۔ یہ اس مدافعت میں پیش پیش تھا ـــــ بلکہ اس زمانے میں، مذہبی محاذ پر ان حضرات کے مقابلہ میں تنہا طلوع اسلام تھا۔ اس کے اس زمانے کے فائل اس پر شاہد ہیں۔ علماء حضرات کی طرف سے مخالفت میں سرفہرست، دیوبند کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) تھے۔ (ہم نے یہاں مرحوم مودودی صاحب کا نام عمداً نہیں لیا کیونکہ ان کی مخالفت کا انداز ان سے الگ تھا)۔

تشکیل پاکستان کے بعد ہم نے اس ورق کو الٹ دیا اور ان (یا ان کے دیگر ہمنوا) حضرات کے خلاف از خود ایک لفظ تک نہیں لکھا، لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ان کے معتقدین وقتاً فوقتاً، اس بحث کو اٹھاتے، اور یہ ثابت کرنے کی سعیٔ ناکام کرتے رہتے ہیں کہ

(۱) یہ (مخالفین علماء) قوم کے دشمن نہیں تھے۔ اسی طرح قوم کے بہی خواہ تھے جس طرح مطالبۂ پاکستان کے مدعی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مفاد مضمر دیکھتے تھے، اور یہ علیحدہ مملکت کے قیام میں۔ اس اختلاف کی بنیاد مذہب نہیں تھی۔ اور

(۲) تشکیل پاکستان کے بعد، یہ حضرات، اس مملکت کے استحکام کے دل و جان سے متمنی تھے۔

چونکہ تحریک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی اس لئے یہ حضرات اس سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ طلوع اسلام اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ ان کے اس جھوٹے

پروپیگنڈہ کا ازالہ کرے۔

اس وقت ہمارے سامنے، ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۸۱ء کا ہفتہ وار چٹان ہے جس میں عبدالرحمان خان شیدا، نامی کسی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد اور پاکستان"۔ اس میں انہوں نے اپنی طرف سے بہت کم لکھا ہے۔ دوسرے لوگوں کی آرا، نقل کی ہیں جن کی حیثیت زبانی روایات سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان میں ایک نمایاں واقعہ حسب ذیل ہے جسے انہوں نے سرگودھا کے دلی محمد صاحب کی زبانی درج کیا ہے:-

> اعلانِ آزادی ۳ رجون سنہ ۴۷ء کے بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد شملہ میں قیام فرما تھے۔ ۲۴ رجولائی کو شملہ کے پچیس ۲۵، تیس ۳۰ مسلمان شہریوں کا ایک وفد جس میں، میں بھی شامل تھا' حضرت مولانا سے ملاقی ہوا۔ مولانا نے گفتگو کا آغاز بعد علیک سلیک کے یوں کیا۔ "الحمد للہ ملک' پاکستان اور ہندوستان دو مملکتوں کے طور پر آزاد ہو گیا۔ اب ہمارے سیاسی نظریات کے اختلافات بھی ختم ہو گئے میرا جناح صاحب سے اختلاف دو سیاسی نظریات کا اختلاف تھا۔ نیز اپنے نظریہ میں ہم پُر خلوص تھے قوم نے ایک نظریہ قبول کر لیا اور ایک رد کر دیا۔ اس فیصلے کو میں صدق دل سے قبول کرتا ہوں۔ میری تمنا اور دلی دعا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا ہوا پاکستان مستحکم اور مضبوط ہو اور ترقی کرے خدانخواستہ اب اگر پاکستان میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہوئی تو بدنام اسلام ہوگا۔ بہرحال میری دعا ہے کہ پاکستان اسلامی مملکت بنے۔

تقسیم ہند کے بعد، مولانا مرحوم کے خیالات کیا تھے، اسے ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ جریدہ، مدینہ (بجنور) کی زبانی سنیئے۔ اس نے اپنی ۵ رمارچ سنہ ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں، مولانا آزاد کی وہ تقریر شائع کی تھی جو انہوں نے اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء میں، مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے، جامع مسجد (دہلی) میں کی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا:-

> ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ.... دو قوموں کا نظریہ حیات مسلمانوں کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔...... تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا غول تھا' ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا ہوا کرتا ہے...... مجھے آج جو کہنا ہے اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا،...... ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔
>
> (بحوالہ طلوع اسلام۔ بابت اپریل مئی سنہ ۱۹۵۸ء)

ان اقتباسات کی رُو سے، مولانا مرحوم نے کہا تھا کہ جناح کے ساتھ، ان کا اختلاف دو قومی نظریہ کے متعلق تھا۔ اور یہ اختلاف محض سیاسی تھا جو تشکیلِ پاکستان کے بعد ختم ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ دو قومی نظریہ کے

کے متعلق ان کا اختلاف محض سیاسی تھا یا وہ اسے (معاذ اللہ) اسلام کا ناکام تجربہ خیال کرتے تھے؟ اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود مولانا مرحوم کی اپنی زبان سے سنیئے (INDIA WINS FREEDOM) ان کی وہ کتاب ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کرایا اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، وہ اس میں لکھتے ہیں:۔

یہ بہت بڑا فریب ہے جو لوگوں کو دیا جا رہا ہے کہ (مغربی اور مشرقی پاکستان کے دو خطوں کے) مسلمان جو ایک دوسرے سے جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے مختلف ہیں، مذہب کی بنیاد پر ایک قوم بن جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایسا چاہا تھا[1] کہ ایک ایسے معاشرہ (اُمّت) کی تشکیل کی جائے جو نسلی۔ لسانی۔ اقتصادی اور سیاسی حدود سے ماورا ہو۔ تاریخ نے لیکن یہ ثابت کر دیا کہ چند سالوں (یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی) کے بعد، اسلام اس قابل نہ رہا کہ وہ محض دین کی بنیادوں پر ایک مملکت کی تشکیل کر سکے۔ (یعنی اسلام اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ لہٰذا اب اس ناکام تجربہ کو دُہرانا، حماقت ہے اور فریب دہی۔ معاذ اللہ)۔

(ص ۲۲۷)

کیا فرماتے ہیں، محترم شیدا صاحب اور ان کے راوی حضرات بیچ اس باب کے کہ دو قومی نظریہ پر مولانا مرحوم کا اختلاف محض سیاسی تھا یا وہ اسے "اسلام کا ایک ناکام تجربہ" تصوّر کرتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم، اسلام کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۸۱ء کے نوائے وقت میں، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ "علامہ اقبالؒ اور تفسیر مولانا ابوالکلام آزاد"۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

کانگرس میں شمولیت کے بعد، لاہور کی ایک نشست میں، مولانا آزاد اور علامہ اقبالؒ کے درمیان اسلامیانِ ہند کے سیاسی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دورانِ گفتگو مولانا آزاد نے ایک ایسا جملہ کہا کہ جو حضرت علامہؒ کی طبع پر بے حد گراں گذرا۔ ایک ممتاز عالم دین سے یہ سُن کر علامہؒ لرز گئے۔ بقول سید نذیر نیازی (مرحوم) علامہؒ نے بعد میں ان سے فرمایا کہ میری طبیعت اتنی مشتعل ہوئی کہ جی چاہا کہ اس امام الہند کو وہ سناؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ اس نے یہ اذیّت ناک الفاظ کہے تھے "ڈاکٹر صاحب! آپ کس اسلام کی بات کرتے ہیں؟ (ISLAM IS A SPENT FORCE) یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے"۔

ہم اس واقعہ کو اس لئے صحیح سمجھتے ہیں کہ یہ مولانا آزاد کی (مندرجہ بالا) خود نوشت سوانح حیات کے بیان

---

[1] "اسلام نے ایسا چاہا تھا"۔ یہ دین کا تقاضا نہیں تھا!

کے عین مطابق ہے!

اب آپ نے سمجھا کہ مولانا آزاد (مرحوم) نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی؟ انہیں اس اسلام کی صداقت اور ابدیت پر یقین ہی نہیں تھا جو مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھا۔ ایسے شخص کے متعلق یہ کہنا تہمت تراشی کے سوا کیا کہلا سکتا ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ

میری تمنا اور دلی دعا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا ہوا پاکستان مستحکم اور مضبوط ہو اور ترقی کرے۔ خدانخواستہ اب اگر پاکستان میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہوئی تو بدنام اسلام ہوگا۔ بہرحال میری دعا ہے کہ پاکستان اسلامی مملکت بنے۔

وہ تو خدا سے دعائیں مانگ رہے ہوں گے کہ پاکستان ناکام رہے تاکہ وہ...... دنیا سے کہہ سکیں کہ دیکھا! میں نے جو کچھ کہا تھا وہ کس طرح صحیح ثابت ہو کر سامنے آگیا۔ میں نے بہت پہلے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ "اسلام ناکام رہ چکا ہے۔ اور اس ناکام تجربے کو دہرانا، حماقت ہے اور فریب دہی!" یہ نہ مانے اور اب اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔

ان لوگوں کی اسلام کی طرف سے یہی مایوسی تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نگہبانِ حرم معمارِ دَیر است — یقینش مردہ و چشمش بغیر است!
ز اندازِ نگاہِ او تواں دید — کہ نومید از ہمہ اسبابِ خیر است (ارمغانِ حجاز)

ہم اپنے ان مقالہ نگاروں سے گذارش کریں گے کہ وہ ان گڑے مُردوں کو اکھیڑنے سے اجتناب ہی کریں تو بہتر ہے۔ اس سے آنجے مقتدایان کا کفن میلا ہونے کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

(۰)

۲- ہماری صحافت

مدیر طلوعِ اسلام نے مندرجہ ذیل خط، مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۸۱ء کو، روزنامہ نوائے وقت، کو بھیجا' جو آج تک شائع نہیں ہوا۔

مؤقر جریدہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۶ اپریل ۱۹۸۱ء میں بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) منظور احمد صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے..... "مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور۔ سید نذیر نیازی"...... اس میں کہا گیا ہے کہ جب مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر (ترجمان القرآن) کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اس کے مرکزی خیال (کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں) کو محلِ نظر قرار دے کر، سید نذیر نیازی (مرحوم) کی سعی و کاوش سے جامعہ ملیہ (دہلی) میں ایک نجی مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی جس میں مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ انہوں نے حسبِ معمول دفع الوقتی سے کام لیا۔

قارئینِ "نوائے وقت" کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ مولانا آزاد کی تفسیر کے اس مرکزی خیال

کی تردید میں پرویز صاحب نے ایک مبسوط اور مدلّل مقالہ لکھا تھا جو ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) کی جنوری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ پرویز صاحب کے مولانا مرحوم کے ساتھ مراسم تھے اس لئے انہوں نے اس مقالہ کو خود مولانا مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تھا لیکن انہوں نے اس پر بھی ٹال مٹول سے کام لیا —— اس مقالہ نے مولانا مرحوم کے معتقدین کے حلقہ میں خاصا اضطراب پیدا کر دیا تھا، حتیٰ کہ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، ایک وفد کے ساتھ مولانا کی خدمت میں کلکتہ حاضر ہوئے کہ انہیں اس تنقید کا جواب لکھنے پر آمادہ کر سکیں لیکن بے نیلِ مرام واپس آ گئے۔ چنانچہ اس مقالہ کا جواب نہ تو مولانا آزاد مرحوم نے لکھا نہ ان کے معتقدین میں سے کسی نے۔ البتہ اس کا ہندی ترجمہ کانگریس کی طرف سے، چھپ کر کثیر تعداد میں شائع ہوا۔ پرویز صاحب کا مضمون متعدد بار شائع ہوا، اور اب ان کے مجموعہ مضامین "فردوسِ گم گشتہ" میں شامل ہے۔ اس میں اس موضوع کے بڑے اہم گوشے آ گئے ہیں۔ والسلام

دوسرا خط

اسی طرح ذیل کا خط انہیں مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۸۱ء کو بھیجا تھا جو باوجود یاددہانیوں کے شائع نہیں ہوا۔

نوائے وقت بابتہ ۱۹ فروری ۱۹۸۱ء میں "سید نذیر نیازی اور طلوعِ اسلام" کے عنوان سے محمد عبداللہ چغتائی صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ

> نیازی (مرحوم) نے ایک رسالہ "طلوعِ اسلام" جاری کیا جو اپنے حالات کے تحت اہلِ قرآن پرویز صاحب کے پاس آ گیا۔

اہلِ قرآن ایک فرقہ ہے جس کے خلاف پرویز صاحب بکثرت لکھ چکے ہیں۔ ان کے ایک پمفلٹ کا عنوان ہی "فرقہ اہلِ قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں" ہے۔ اندریں حالات معلوم نہیں چغتائی صاحب نے اس بے سروپا الزام کو پرویز صاحب کے سر کیسے تھوپ دیا۔

چونکہ اس سے نہ صرف پرویز صاحب بلکہ مجلّہ طلوعِ اسلام کے متعلق بھی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے اس کی تصحیح کی غرض سے میرے اس عریضہ کو "نوائے وقت" میں شائع فرما دیا جائے۔ شکریہ

یعنی کسی کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی باتیں تو شائع کی جا سکتی ہیں، لیکن اس کی تردید میں سچی بات بھی اشاعت کے قابل نہیں سمجھی جاتی۔

(-)

۳۔ قرآنِ مجید اور ہمارے علماءِ کرام!

(مسلمانوں کے سوا) دنیا میں کوئی اہلِ مذہب ایسے نہیں جن کے پاس' ان کی (پیغمبر) آسمانی کتاب' اپنی اصل اور

غیر محرف شکل میں موجود ہو۔ ان کتابوں میں یہ تحریف متعلقہ مذاہب کے مخالفین نے نہیں کی تھی۔ خود اس مذہب کے پیشواؤں (احبار و رہبان) نے ایسا کیا تھا۔ آسمانی کتاب ان کی من مانیوں کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کانٹے کو نکال باہر کرنے کی یہ تدبیر سوچی کہ کتاب کے ان تمام حصّوں کو بدل دیا جائے جو ان کے مفادات اور خواہشات کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب (قرآنِ مجید) کو نازل کیا تو (منجملہ دیگر امور) اس کی وضاحت کر دی کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ..... (۶/۱۱۵)

تیرے رب نے جو کچھ نوعِ انسان سے کہنا تھا وہ اس کتاب میں، صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

یعنی خدا کی یہ کتاب (۱) مکمل ہے اس لئے اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ (۲) غیر متبدل ہے اس لئے اس کے کسی حکم میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اور (۳) محفوظ ہے۔ اس لئے اس میں کوئی تحریف بھی نہیں کر سکے گا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب، مذہبی پیشوائیت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے گرد حصار ایسا باندھ دیا تھا کہ اس تک کسی غلط اندیشی کی رسائی نہ ہو سکے۔ لیکن تدبیریں سوچنے والوں کا ذہن بڑا ادراک ہوتا ہے۔ انہوں نے اس حصار کو توڑنے کی تدبیریں سوچ ہی لیں۔ ویسے تو یہ تدبیریں ہزار سال سے ہماری مذہبی کتابوں میں لکھی چلی آ رہی تھیں، لیکن آج کل ایک ضرورت کے تحت، ان کا چرچا عام ہونے لگا ہے۔

پاکستان میں "اسلامی قوانین" مرتب کرنے کا سوال سامنے آیا تو ہمارے علماء حضرات نے، روا روی میں کہہ دیا کہ کوئی قانون جو کتاب و سنت کے خلاف ہو گا، غیر اسلامی قرار دیا جائے گا۔ کہنے کو تو ایسا کہ دیا ــــ ولے افتاد مشکل ہا ــــ ملک میں سزائے رجم کا قانون یہ کہہ کر نافذ کرا دیا کہ یہ کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے اس کا تجزیہ کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ قرآن میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ اس لئے یہ قانون خلافِ اسلام ہے۔ اس پر ان حضرات کو بڑی مشکل لاحق ہوئی کہ اب کیا کریں؟ لیکن اس کا حل ان کے پاس موجود تھا۔ ہفت روزہ اہلِ حدیث، لاہور کی ۲۴ اپریل ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں اس موضوع پر ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

آج رجم کے بارے میں جو کچھ سمجھا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے، تقریباً چودہ سو سال پہلے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضؓ نے اس سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق انہوں نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا: "بیشک اللہ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب

نازل فرمائی۔ جو کچھ اللہ تعالےٰ نے نازل فرمایا اس میں آیتِ رجم بھی تھی۔ ہم نے اسے پڑھا، سمجھا اور یاد کیا۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق قرآن میں وہ آیت تھی۔ لیکن جو قرآن اُمت کے پاس متوارث چلا آرہا ہے، اس میں وہ آیت نہیں۔ تو وہ آیت کہاں چلی گئی؟[1] اور قرآن نامکمل ہو گیا؟ اس کا جواب سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

مذکورہ بالا حوالوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک سوال سامنے آتا ہے کہ دو انسانی زندگیوں کو ایک امرِ ممنوع کے مرتکب ہونے پر رجم کر دینا ایک بڑا ہی اہم مسئلہ ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اب وہ..... آیت کیوں نہیں حالانکہ دوسرے مسائل کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا، تو ایسے اہم مسئلہ کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ اگر عمر فاروق رضؓ کی بات کو درست مان لیا جائے تو پھر آیتِ رجم کو منسوخ کیوں کیا گیا؟ ان سوالات کو حل کرنے سے پہلے قرآن کے ناسخ و منسوخ کے اسلوب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سو واضح ہو کہ ناسخ و منسوخ کے بارے میں مفسرین اور ماہرین اصولِ تفسیر نے لکھا ہے کہ قرآن میں کچھ ایسی آیات بھی تھیں جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی لیکن حکم جاری ہے۔ کچھ ایسی تھیں جن کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ کر دیئے گئے۔ دوسرے علماء کے علاوہ، شاہ ولی اللہؒ نے بھی الفوز الکبیر میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ (اہلِ حدیث۔ ۲۴ اپریل ۸۱ء)

قرآنِ کریم میں تحریف کی وہ تدبیر جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے، ناسخ و منسوخ کا عقیدہ ہے۔ اقتباسِ بالا میں اس کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں لیکن درحقیقت اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) قرآنِ کریم میں کچھ آیات نازل ہوئیں۔ بعد میں انہیں قرآن سے نکال دیا گیا لیکن حکم ان کا باقی رکھا۔ پھر سن لیجئے کہ ان کے اس عقیدہ کی رُو سے، قرآن میں آیات تو نہیں۔ لیکن ان کا حکم بدستور باقی ہے۔

(۲) ایسی آیات بھی نازل ہوئیں جنہیں بعد میں قرآن سے نکال دیا گیا اور ان کا حکم بھی باقی نہ رہا۔ اور

(۳) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔

یہ حلیہ بنا دیا گیا ہے اس کتابِ عظیم کا جس کے متعلق خود خدا نے کہا تھا کہ وہ مکمل بھی ہے۔ غیر متبدل بھی، اور ابدی طور پر محفوظ بھی۔ لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ... ۵ (۴۱/۴۲) "باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے، نہ پیچھے سے"۔

ناسخ و منسوخ کی ان تین شقوں کا تجزیہ کیجئے۔ شقِ اوّل یہ ہے کہ آیت تو قرآن میں موجود نہیں لیکن اس کا حکم موجود ہے، جس پر عمل کرنا فریضۂ خداوندی ہے ـــــ آپ نے دنیا میں کوئی ایسی کتاب بھی دیکھی،

---

[1] طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مئی ۸۱ء میں بتایا جا چکا ہے کہ روایات کی رُو سے، اس آیت کو حضرت عائشہ رضؓ کی بکری کھا گئی تھی!

سنی ہے جس میں الفاظ نہ ہوں۔ فقرے نہ ہوں۔ عبارت نہ ہو۔ لیکن حکم یہ ہو کہ تم نے اس کے مطابق عمل کرنا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ جب ان حضرات سے پوچھا جائے کہ وہ کونسا حکم ہے جس کی تعمیل ہم پر فرض قرار دی گئی ہے، تو یہ عربی زبان کا ایک فقرہ آپ کے سامنے رکھ دیں گے کہ یہ ہے وہ حکم خداوندی! جب کہا جائے کہ یہ حکم خدا کی کتاب میں تو ہے نہیں، تو جواب ملے گا کہ بے شک یہ خدا کی کتاب میں نہیں لیکن ہمارے پاس ہے۔ حکم اسی آیت کا چلے گا جو ہمارے پاس ہے، نہ کہ اس قرآن کا جسے تم لئے بیٹھے ہو۔ ان کی یہ تدبیر انوکھی نہیں۔ قرآن کریم کے بیان کے مطابق سابقہ مذاہب کے پیشوا بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۷۸)

اور ان میں سے ایک فریق ہے کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب تاکہ تم جانو کہ وہ کتاب میں ہے۔ اور وہ نہیں کتاب میں۔ اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے۔ اور وہ نہیں اللہ کا کہا، اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جان کر۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

اس پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حاشیہ میں لکھتے ہیں:۔

اہل کتاب کی تحریف کا حال بیان فرمایا۔ یعنی آسمانی کتاب میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے گھٹا بڑھا کر ایسے انداز اور لہجے میں پڑھتے ہیں کہ ناواقف سننے والا دھوکے میں آجائے، اور سمجھے کہ یہ بھی آسمانی کتاب کی عبارت ہے۔ یہی نہیں، بلکہ زبان سے دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے، حالانکہ نہ وہ مضمون کتاب میں موجود ہے۔ اور نہ خدا کے پاس سے آیا ہے۔

یہ حضرات بھی عربی زبان کے چند الفاظ (اذ زنی الشیخ والشیخة فارجموهما) پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے وہ آیت جو قرآن میں تھی (هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ)۔ اور ارشاد خداوندی ہے کہ (مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ) یہ خدا کی نازل کردہ آیت نہیں..... خدا کی نازل کردہ آیات سب کی سب اس کی کتاب میں محفوظ ہیں۔

یہ ہے رجم کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل!

(۲) ناسخ و منسوخ کی (ان کے نزدیک) دوسری قسم وہ آیات ہیں جو پہلے قرآن میں نازل ہوئیں لیکن انہیں بعد میں قرآن سے نکال دیا گیا اور ان کا حکم بھی باقی نہ رہا۔

اس اعتبار سے ان آیات کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ کیونکہ جو آیت نہ موجود ہے، نہ اس کا حکم باقی، اس کا ہم سے تعلق کیا ہے؟ لیکن اس عقیدہ کی رُو سے قرآن کریم کے، خدائے علیم و خبیر کی کتاب ہونے کے خلاف جو اعتراض پڑتا ہے، اس سے تو اغماض نہیں برتا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک آیت

قرآنِ کریم میں درج کی جاتی تھی یا اسے حفّاظ حفظ کرتے تھے۔ وسیع و عریض مملکت میں اس کی تلاوت ہوتی تھی۔ تو اس کے بعد جب ایسے قرآن سے خارج کر دیا جاتا تھا تو اس کے لئے طریق کیا اختیار کیا جاتا تھا؟ آج کے دور میں تو ایسا کرنا پھر بھی آسان ہے۔ سرکاری گزٹ میں تنسیخ کا حکم جاری کر دینے سے، وہ حکم منسوخ قرار پا جاتا ہے، لیکن عہدِ نبوی میں تو نشر و اشاعت کے یہ طریق رائج نہیں تھے۔ اُس زمانے میں کیا کیا جاتا تھا؟ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خدا اس کا انتظام خود کر دیتا تھا۔ وہ کیسے؟ سنیئے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب "الاتقان" (حصہ دوم) میں لکھا ہے:-

> طبرانی نے اپنی کتاب کبیر میں، ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا "دو آدمیوں نے ایک سورت پڑھی جس کو خود رسول اللہؐ نے انہیں پڑھایا تھا۔ وہ دونوں آدمی نماز میں اسی سورت کو پڑھا کرتے تھے۔ ایک رات کو وہ دونوں آدمی نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو ان کو اس سورت کا ایک حرف تک یاد نہ آیا، لہٰذا صبح ہی وہ رسول اللہ کے پاس آئے اور انہوں نے شب کا ماجرا بیان کیا۔ رسول اللہؐ نے ان کا حال سن کر فرمایا۔ وہ سورت منسوخ شدہ قرآن میں تھی۔ لہٰذا تم اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔
>
> (اُردو ترجمہ، جلد دوم۔ صفحہ ۲۶)

یہ طریق تو (بقول ان حضرات کے) ان آیات کے متعلق اختیار کیا گیا جو لوگوں کو حفظ یاد تھیں۔ جو آیات لکھی ہوئی تھیں، معلوم نہیں انہیں کس طرح محو کیا گیا؟

(۳) تیسری قسم ان آیات کی ہے جو قرآن میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ وہ صرف تلاوت کے ثواب کے لئے قرآن میں رہنے دی گئی ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود کسی آیت کے متعلق نہیں بتایا کہ یہ منسوخ ہے اس لئے مذہبی پیشوائیت کی مرکب رائی کے لئے یہ میدان بڑا وسیع ہے۔ جس آیت کے متعلق جی چاہا کہہ دیا کہ اس کا حکم منسوخ ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں قرآن کی کوئی آیت ہی دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہو۔ حدیث بھی قرآنی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے۔

آپ کے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ خدا کی کتاب کے سلسلہ میں اس قدر بے پایاں تبدیلیوں کی اتھارٹی کس کو حاصل ہے؟ خدا نے تو ایسا کہیں نہیں کہا۔ اس سوال کا جواب اس اقتباس میں موجود ہے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:-

> واضح ہو کہ ناسخ و منسوخ کے بارے میں مفسّرین و ماہرینِ اصولِ تفسیر نے لکھا ہے کہ.....

یعنی یہ اتھارٹی مفسرین و ماہرینِ اصولِ تفسیر کو حاصل ہے۔ موجودہ علماء اپنے سے پہلے دور کے علماء کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔ بعد میں آنے والے، موجودہ دور کے علماء کو سلفِ صالحین کے زمرے میں شامل کر کے، بطور سند پیش کر دیں گے۔ یوں یہ حضرات اپنے آپ کو اختیاراتِ خداوندی کا حامل قرار دے لیتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۹/۳۱)" یہ لوگ اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا لیتے ہیں۔ جب

ان خداؤں کا حکم، قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ ہو، تو اسے (THEOCRACY) تھیاکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی حکومت۔ (خدا = THE) اور حکومت۔ (CRACY)۔ اور اس سے ہر صاحبِ ہوش خدا کی پناہ مانگتا ہے۔

آدمی کو خدا نہ دکھلائے۔ آدمی کا کبھی خدا ہونا

جب کوئی (خدا کا منکر) چنگیز یا ہلاکو، دوسرے انسانوں پر ظلم و ستم کرے، تو توقع کی جا سکتی ہے کہ شاید اس کے دل میں کبھی اس کے خلاف کھٹک پیدا ہو جائے، لیکن جب خدائی خود ساختہ اس قسم کے مظالم، خدا کے نام پر کریں، تو ان کے دل میں اس کے خلاف کھٹک پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ اُسے کارِ ثواب سمجھ کر سرانجام دیتے اور موجبِ خوشنودیٔ خداوندی قرار دیتے ہیں۔ جس اذیت رسانی کو کارِ ثواب سمجھا جائے، اس کی شدت کی انتہا نہیں ہوتی۔ تھیاکریسی اسی لئے بدترین نظامِ حکومت ہوتی ہے۔

۴۔ رجم کا حکم اور مفتی محمد شفیعؒ

کراچی کے روزنامہ جنگ کی ۷ اپریل ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں، مفتی محمد شفیعؒ کا ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں رجم کے متعلق کم و بیش وہی دلائل دیئے گئے ہیں جو اوپر مذکور ہیں۔ انہوں نے البتہ ایک اضافہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

> جب خوارج نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے رجم پر یہ اعتراض کیا کہ اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے تو حضرت عمرؒ نے ان سے کہا کہ پھر رکعاتِ نماز کی تعداد اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے ثابت ہوئیں؟ انہوں نے کہا کہ حضورؐ اور مسلمانوں کے عمل سے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا۔ رجم بھی اسی طرح ثابت ہوا۔

معلوم نہیں خوارج نے اس کا کیا جواب دیا، لیکن تقلید کا بُرا ہو کہ وہ انسان کو اس قسم کی بدیہیات کے سمجھنے کے بھی قابل نہیں چھوڑتی۔ قرآن میں: أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ (صلوٰۃ قائم کرو) کا حکم موجود ہے، لیکن اس کی (اور زکوٰۃ کے حکم کی) تفصیلات اس میں نہیں دی گئیں۔ ان تفصیلات کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ یہ حضورؐ اور مسلمانوں کے عمل میں ملیں گی۔ لیکن رجم کا تو حکم ہی قرآن میں نہیں۔ تو جب حکم ہی قرآن میں نہیں، اس کی تفصیلات کا سوال کیسے پیدا ہو گا؟ یہی نہیں کہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں۔ یہ قرآن کے حکم کے خلاف ہے۔ قرآن میں زانی اور زانیہ کی سزا مِائَةَ جَلْدَةٍ ..... (۲۹/۳) "سو کوڑے" ہے۔ یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی تفصیلات کہ کوڑے کس قسم کے ہونے چاہئیں۔ کس طرح لگائے جائیں۔ استثنا کن حالات میں کی جائے، وغیرہ۔ قرآن میں نہیں۔ انہیں حضورؐ اور مسلمانوں کے عمل میں دیکھا جائے گا۔ لیکن قرآن میں حکم تو ہو سو کوڑوں کا اور ہم اس کی "تفصیل" میں کہیں کہ مجرم کو زمین میں گاڑ کر پتھروں سے مار دیا جائے۔ کیا اُسے قرآنی حکم کی تفصیل اور تشریح کہا جائے گا، یا قرآن کے حکم کے خلاف ایک مستقل حکم؟

مفتی صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ

آنحضرتؐ سے رجمؐ کا ثبوت معناً ایسا ہی متواتر ہے جیسے حضرت علیؓ کی شجاعت اور حاتم طائی کی سخاوت۔

اس پر ہم، اس کے سوا کہ مفتی صاحبؒ کے حق میں دعائے خیر کریں، اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

۵۔ مفتی صاحبؒ اور جن

کراچی ہی کے ایک اخبار (غالباً جنگ) میں، کوثر نیازی صاحب کا ایک (سلسلہ وار) مضمون چھپا تھا جس میں جنات کے متعلق بحث کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں نیازی صاحب نے، مفتی محمد شفیعؒ کے ایک ذاتی مشاہدہ کا تذکرہ کیا۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا تھا:۔

ایک زمانہ میں خود میری بیوی پر جن مسلط ہو گیا۔ میں نے اس سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔ میں نے اس سے ثبوت چاہا کہ وہ واقعی جن ہے تو اس نے کہا کہ آپ کچھ فرمائش کر کے دیکھ لیں۔ میں نے عجیب فرمائش کی کہ الائچی کے درخت سے ایک ایسی سبز ٹہنی لے کر آؤ جس پر سبز الائچی لگی ہو۔ اب یہ درخت ہمارے ہاں تو ہے نہیں، میں نے سوچا کہاں سے لائے گا۔ تھوڑی ہی دیر میں سبز شاخ پر سبز الائچی میری گود میں تھی۔ اب میں نے اس کی مسلمانی کا امتحان لیا۔ میری بیوی عربی نہیں جانتی تھی۔ میں نے کہا۔ قصیدہ بردہ کے کچھ عربی اشعار سناؤ۔ اس نے فر فر قصیدہ سنانا شروع کر دیا۔

مفتی صاحبؒ مرحوم سے ویسے قارئینِ طلوعِ اسلام کو قدیمی تعارف حاصل ہے۔ جب غیر منقسم ہندوستان میں لاؤڈ سپیکر نیا نیا آیا ہے تو ان سے اس کے استعمال کے جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا تھا۔ انہوں نے، الیگزنڈرا ہائی اسکول، بھوپال کے سائنس ماسٹر، برج نندن لال صاحب سے اس آلہ کی ماہیت اور کیفیت معلوم کرنے کے بعد، عبادات میں اس کے استعمال کو حرام قرار دیا تھا ——— (ملاحظہ ہو، سلیم کے نام خطوط۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۹) ——— یہ الگ بات ہے کہ پھر یہ آلہ ہر مسجد میں نصب ہو گیا۔ اور خود مفتی صاحبؒ کے سامنے بھی۔

(۰)

۶۔ اقبالؒ اور مولوی صاحبان

تحریکِ پاکستان کے دوران، ہمارے ایک ملنے والے نیشنلسٹ ذہنیت کے نوجوان تھے۔ ایک دن، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ (مرحوم) کے درمیان وطنیت پر بحث کے سلسلہ میں بات ہو رہی تھی تو اس نوجوان نے کہا کہ آپ علامہ اقبالؒ کو سکالر بے شک کہہ سکتے ہیں لیکن انہیں عالم تو نہیں کہا جا سکتا۔

یہ لطیفہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے جو ہمارے علماء حضرات کے ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے اقبالؒ کو کبھی عالم تسلیم نہیں کیا۔ نہ ہی مذہب کے معاملہ میں ان کی کسی رائے کو درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ اقبالؒ کو جو مفکرِ پاکستان اور قائدِ اعظمؒ کو بانیٔ پاکستان کہا جاتا ہے، تو یہ انہیں سخت ناگوار گزرتا ہے۔ چنانچہ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ ان سے یہ اعزاز (CREDIT) چھین لیا جائے۔ ہفت روزہ "اہلِ حدیث" لاہور کی ۲۰ فروری ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں علماء کے کارناموں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے:-

> اس اسلامی ریاست (پاکستان) کے مفکر علامہ اقبالؒ نہیں، مجدد سرہندی اور محدث دہلوی ہیں جن سے ڈاکٹر اقبالؒ نے یہ فیض حاصل کیا۔ اور اس کے بانی محمد علی جناح نہیں بلکہ سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور ان کے جانباز رفقاء ہیں جنہوں نے اسلامی مملکت کے قیام کے لئے اس آخری دور میں رسمِ شہادت کو ارزاں کیا۔

اس سے آپ نے اندازہ لگایا کہ قرآنِ کریم نے اپنے آخری ورق پر: مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ (۱۱۳/۵) سے پناہ مانگنے کی تاکید کیوں کی ہے؟ حسد انسان کو یہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ ہم جریدہ اہلِ حدیث کی خدمت میں عرض کریں گے کہ جن بزرگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان کی خدمات اپنے مقام پر بجا اور درست۔ لیکن تاریخ کو مسخ کرنے سے ان میں کچھ اضافہ ہونے کے بجائے کمی ہی ہو گی۔ اس کا خیال رہے۔

۷۔ مغرب میں اسلام کا فروغ

ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ آجکل یورپ اور امریکہ میں، بڑی کثرت اور سرعت سے اسلام پھیلایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ وہی اسلام ہے جو اُن سرمایہ دار، استعماریت پسند، اقوام کے مفید مطلب ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب شروع شروع میں کمیونزم کا چرچا ہوا ہے اور انہوں نے یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ "دنیا کے محنت کشو باہم متحد ہو جاؤ" تو امریکہ سے (مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے) یہ آواز بلند ہوئی تھی کہ "دنیا کے خدا پرستو! باہم متحد ہو جاؤ" اور اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کرو"۔ دنیا بھر کے خدا پرستوں کو اتحاد کی دعوت، درحقیقت، نظامِ سرمایہ داری کی مدافعت کے لئے، کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام کی کوشش تھی، ورنہ امریکہ اور یورپ کی خدا پرستی اور روس کے کفر و الحاد میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ یہی کیفیت اس اسلام کی ہے جو آج کل یورپ اور امریکہ میں پھیلایا جا رہا ہے۔

۷ مارچ ۱۹۸۱ء کے (کراچی کے) روزنامہ ڈان میں، الیاس، بابر یونس نامی ایک صاحب کا، عنوانِ بالا کے تحت ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اس امر پر پُرجوش اظہارِ مسرت کیا ہے کہ امریکہ میں اسلام بڑے زور شور سے پھیل رہا ہے۔ یہ صاحب، سٹیٹ یونیورسٹی، نیویارک میں عمرانیات کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہاں اسلام کی یہ اشاعت "بیشتر" تبلیغی جماعت"

کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔

ہمارے قارئین تبلیغی جماعت سے تو متعارف ہوں گے۔ وہ جس کے مبلغ، گھر گھر جاکر، مسلمانوں کے کلمہ کی اصلاح اور ان کی ڈاڑھی اور مونچھوں کی شرعی ہیئت کے لئے مصروفِ جہاد رہتے ہیں۔ لاہور کے قریب رائے ونڈ میں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے جس میں لاکھوں افراد جمع ہو کر اعلائے کلمۃ الحق (یعنی ذکر جلی) کرتے ہیں۔ با۔ یونس صاحب نے لکھا ہے کہ اس جماعت نے، سال گذشتہ ڈیٹرائیٹ (DETROIT) میں اپنا عالمگیر اجتماع (ورلڈ کنونشن) منعقد کیا تھا۔ مقالہ میں لکھا ہے کہ امریکی نومسلموں کو اسلام لانے کے بعد، رویت ہلال۔ ذبیحہ۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں شادی۔ اور وراثت جیسے اہم مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

روزنامہ ڈان ہی کی ۲۵ مارچ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں، امریکن یونیورسٹی کے مصری نژاد پروفیسر الخولی (ELKHOLY) کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ "امریکہ میں اسلام کی اشاعت اور فروغ، درحقیقت پاکستانی مسلمانوں کی مساعیٔ حسنہ کا رہینِ منت ہے۔ اس وقت کینیڈا اور امریکہ میں (۲۷) اسلامک سنٹر اور (۳۸) مساجد ہیں"۔

امریکہ ہی سے ایک دوست کا خط آیا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ ان ممالک میں بھی اسلام کے فروغ کے لئے کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔ ٹورانٹو (کینیڈا) سے ایک پندرہ روزہ اخبار (الہلال) شائع ہوتا ہے۔ اس کی ۱۵ اپریل ۸۱ء کی اشاعت میں "اسلام اور زندگی کے مسائل" کے کالم میں حسبِ ذیل مسائل اور ان کے جوابات درج ہیں۔

(۱) اگر سفر میں غلطی سے سمتِ قبلہ کے خلاف نماز پڑھ لی جائے تو وہ نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(۲) قضا نماز کس طرح ادا کی جائے؟

(۳) بچے کی پیدائش پر اس کے کان میں اذان کس طرح دی جائے؟

(۴) باکسنگ کے بارے میں کیا فتویٰ ہے؟

اس قسم کے ہیں "زندگی کے وہ مسائل" جن کا حل اسلام کی رُو سے بتایا جاتا ہے!

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، امریکہ ہو یا کینیڈا۔ انگلینڈ ہو یا روس، وہاں جس اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں، اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ع

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

کیونکہ شرعِ پیغمبرؐ (قرآنی نظام) کے آشکارا ہو جانے سے نہ امریکہ باقی رہتا ہے، نہ روس!

(۰)

دلیل کے بجائے....؟

جماعتِ اسلامی کے کالعدم قرار پا جانے کے بعد ان کی محسوس اور مرئی سرگرمیاں بڑی حد تک ماند پڑ گئیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں طلوعِ اسلام کی مخالفت کی چنگاریاں بدستور سلگ رہی ہیں۔

سزائے رجم کے متعلق طلوعِ اسلام کا موقف بالکل واضح ہے۔ ملک میں اس اصول کو بطور مسلمہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کوئی قانون قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو۔

(i) قرآن کی رو سے، جرمِ زنا کی سزا سو کوڑے ہے۔ اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی تفریق نہیں۔

(ii) دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ سنت کی رو سے، شادی شدہ مجرموں کی سزا رجم ہے، اور غیر شادی شدہ کی کوڑے۔

(iii) ظاہر ہے کہ اگر شادی شدہ مجرم کو رجم کی سزا دی جائے گی تو یہ قرآن کے خلاف ہوگا۔ اور (ان حضرات کے دعویٰ کی رو سے) سنت کے مطابق۔

(iv) غور طلب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی قانون قرآن کے خلاف ہو اور (ان حضرات کے دعویٰ کی رو سے) سنت کے مطابق، تو اسے خلافِ اسلام قرار دیا جائے گا یا مطابقِ اسلام۔

طلوعِ اسلام کا موقف یہ ہے کہ ایسا قانون، خلافِ اسلام قرار پایا جانا چاہئے۔ کیونکہ

(a) "قرآن و سنت" میں اوّلیت قرآن کو حاصل ہے۔ جو قرآن کے خلاف ہے وہ اسلامی قرار نہیں پا سکتا۔

(b) حضورؐ کی حیاتِ طیبہ، قرآن کے مطابق تھی۔ اس لئے کوئی ایسا قول یا عمل جو قرآن کے خلاف ہو، اور حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہو، آپؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی۔ حضورؐ کا ارشاد یا عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ اس لئے فیصلہ قرآن کے مطابق ہونا چاہئے جو حتمی اور یقینی طور پر کتابِ خداوندی ہے۔

(c) ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے انکار یا ترکِ سنت لازم آجاتا ہے۔ اور ترکِ سنت سے ایک مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

(d) یعنی ان حضرات کے موقف کی رو سے، ترکِ سنت سے تو اسلام سے اخراج لازم آجاتا ہے لیکن ترکِ قرآن سے کچھ نہیں بگڑتا۔

یہ ہے متنازعہ فیہ مسئلہ۔ ظاہر ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور دلائل و براہین کی رو سے کسی نتیجہ پر

پہنچنا، بالخصوص اس لئے کہ اس کا تعلق صرف سزائے رجم سے نہیں۔ یہ ایک اصولی نکتہ ہے جس کا تعلق ہر قانون سے ہوگا۔

(کالعدم) جماعتِ اسلامی کے آرگن ترجمان القرآن نے اپنی اشاعت بابت مئی ۱۹۸۱ء میں، اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے معمول کے مطابق طلوع اسلام کے خلاف مغالطہ آفرینی، الزام تراشی اور اشتعال انگیزی سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے یہاں اسلام کے معنی کتاب وسنت والا اسلام کے طے ہیں۔ کیا بلحاظ دستور اور کیا بلحاظ ملت کے اکثریتی نقطۂ نظر کے اور کیا بلحاظ جملہ مدارسِ فکر کے اجماع کے۔ پس وقتی فیصلے کچھ بھی ہوا کریں، آخر کار بات کو لوٹ کے کتاب وسنت والے اسلام ہی پر پہنچنا ہے۔ انکارِ سنت والے اسلام پر نہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اگر کوئی فیصلہ قرآن کے خلاف اور سنت کے مطابق ہو، تو کیا اسے "کتاب وسنت والا اسلام" کہا جا سکے گا؟ وہ تو قرآن کے خلاف، سنت والا اسلام ہی ہوگا۔

دوسرا سوال یہ ہے (اور اسے ہم تیس سال سے دُہراتے چلے آرہے ہیں) کہ کون سے فرقے کا "کتاب وسنت والا اسلام"؟ وہ اسلام تو آج تک کہیں نظر نہیں آیا جس پر "جملہ مدارسِ فکر کے علماء کا اجماع ہو"۔ کسی ایک مسئلہ پر ان کا اجماع تو ممکن ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے۔ اس وقت نہ فرصت ہے نہ گنجائش کہ سنت کے متعلق مختلف فرقوں کے اختلافات کو پیش کیا جائے۔ ہم صرف ایسے "مدارسِ فکر" کے تصورِ سنت کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو اپنی اپنی جگہ نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف ہیں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اور ان کے مدمقابل، مرکزی جمعیت اہل حدیث کے (سابق) صدر مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) حدیث وسنت کے موضوع پر ان دونوں میں ایک تحریری مناظرہ ہوا تھا جسے جمعیت اہل حدیث کی طرف سے ایک کتابچہ میں شائع کیا گیا تھا جس کا نام تھا۔ جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث۔ اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:۔

تحقیق وثبتیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے، اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان ودیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عظیم کے انکار کا... جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔ (ص۴۸)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ص۵۵)

اس کے برعکس مودودی (مرحوم) نے فرمایا تھا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ (صلعم) کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح ومعتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔

(رسائل ومسائل حصہ اوّل۔ ص۲۹۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۱ء)

اور۔

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں، ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلاتنقید قبول کر لینا چاہئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

کیا ترجمان القرآن کے مدیر فرمائیں گے کہ مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کے معیار کے مطابق مودودی صاحب (مرحوم) کا مقام کونسا قرار پاتا ہے؟ ان دونوں کا "کتاب وسنت والے اسلام" کا ایک ہونا تو درکنار، اہل حدیث کے معیار کی رو سے مودودی (مرحوم) دائرہ اسلام سے خارج قرار پا جاتے ہیں۔

جہاں تک سنت کا تعلق ہے، مودودی (مرحوم) کا مسلک یہ تھا کہ حدیث کی کتابوں سے یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ کا کون سا عمل سنت قرار پا سکتا ہے اور کون سا نہیں۔ اس کا فیصلہ "مزاج شناس رسولؐ" کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے۔ (تفہیمات حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۳-۲۴)

اس پر مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) نے فرمایا تھا:۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول اللہؐ کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے، جسے چاہے رد کر دے.... تو یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول اللہ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (صفحہ ۶۳)

کیا مدیر ترجمان القرآن بتائیں گے کہ کتاب وسنت والا وہ کون سا اسلام ہے جو (جملہ مدارسِ فکر کے علماء تو ایک طرف) جماعتِ اہلحدیث اور کالعدم جماعتِ اسلامی کے نزدیک متفق علیہ ہے؟

---(۵)---

اب لیجئے "اکثریتی نقطۂ نگاہ" کا سوال۔ مودودی (مرحوم) نے مسلمان قوم کی اکثریت کے خلاف جو کچھ کہا تھا اس بحر بیکراں کے لئے تو سفینہ درکار ہوگا۔ ہم دو ایک اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا:۔

> یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب ویابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ بابت محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۵۸)

اور۔

> وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ صفحہ ۵)

باقی رہا یہ سوال کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ حق پر ہوتا ہے تو اس باب میں مرحوم نے فرمایا تھا:۔

> اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی۔ صفحہ ۴۵-۴۶)

اب اسی "اکثریتی نقطۂ نگاہ" کو کتاب وسنت والا اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ عوام کو طلوع اسلام کے خلاف اشتعال دلایا جائے۔

لگے ہاتھوں آپ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ حدیث و سنت کے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک کیا ہے۔ طلوعِ اسلام میں ایک چھوٹا سا ٹریکٹ وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا ہے جس کا عنوان ہے "طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک"۔ اس میں لکھا ہے :-

> جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کے مطابق ہو، یا جس سے حضورؐ نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

سنتِ رسول اللہؐ، کہ جسے قرآن کریم حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے، کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

> نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے، سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے۔ یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہؓ کبار کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔

طلوعِ اسلام کے خلاف یہ جھوٹا پراپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ تین نمازوں اور تین دن کے روزوں کا قائل ہے اس لئے تارکِ سنت ہے اس سلسلہ میں مذکورہ بالا ٹریکٹ میں لکھا ہے :-

> (اسلام اپنی حقیقی شکل میں اس نظام میں سامنے آتا ہے جسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

احکامِ اسلامی پر امت میں جس طریق سے عمل ہو رہا ہے وہ اتباعِ سنت نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسا کرنے والے، اور ایسا کرنے کی تاکید کرنے والے، طلوعِ اسلام کو منکرِ سنت کہنا، سراسر کذب و افترا ہے؟

اب دیکھئے وہ منطق کا بند جس تک پہنچنے کے لئے ترجمان القرآن نے یہ سارا طومار کھڑا کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

> نو میں جناب مستفسر سے عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں جو گروہ اکثریت کے خلاف مراصد میں دانت لگا کے بیٹھتے ہیں اور پھر جب ان کا کوئی وار کاری نکل جاتا ہے تو اس پر خوشی مناتے، اکثریت کو چڑاتے ہیں، وہ کبھی نہ کبھی وقت اس زمانے کا خمیازہ بھگتیں گے ان کی حالیہ کامیابی نہ کے عام اور علماء کی محنتوں کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اوپر سے وارد ہوئی ہے۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ ترجمان القرآن میں جو بار بار اکثریت کا ذکر کیا جا رہا ہے تو اس سے مقصد طلوعِ اسلام کے خلاف عوام کو مشتعل کرنا ہے۔

آہ! بیچارہ "دو قومی نظریہ"

(کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو)

پرویز

زندہ قومیں، ان اساسات کی جو اُن کی مملکت یا قومیت کی بنیاد ہوتی ہیں بڑی شدت اور حمیت سے حفاظت کرتی ہیں۔ اور کسی ایسی حرکت یا جنبش کو نہ روا رکھ سکتی ہیں نہ برداشت کر سکتیں جو اس میں ذرا سا بھی تزلزل پیدا کرنے کا موجب ہو۔ اس کے برعکس جن قوموں کے دل میں اپنی مملکت یا آزادی کی اہمیت نہیں رہتی اُن میں ان اساسات کے خلاف دساوس انگیزیاں اور شکوک طرازیاں معمول بن جاتی ہیں جن سے رفتہ رفتہ اُس مملکت کی عمارت ہی ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ بدقسمتی سے مملکتِ پاکستانیہ شروع ہی سے اس قسم کی وسوسہ انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کی آماجگاہ بنے چلی آ رہی ہے۔

مطالبۂ پاکستان کی اساس و بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیت کی تشکیل اشتراکِ وطن کی بنیادوں پر نہیں ہوتی۔ ایمان کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ہندوستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم نہیں۔ یہاں کے مسلمان اپنے دین کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ ایک قوم ہیں، اس لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت کے دعویدار۔ ہندوستان میں اس نظریہ اور دعوے کی مخالفت ہوئی ـــــ ہندوؤں کی طرف سے بھی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے بھی۔ اور ہم (تحریکِ پاکستان کے مؤیدین) نے اِن کے ہر اعتراض کا جواب دیا۔ توفیقِ ایزدی سے ہمیں کامیابی ہوئی اور اس طرح مملکتِ پاکستان وجود میں آ گئی۔

اس خطۂ زمین میں پہلے سے بھی کچھ لوگ بستے تھے اور اس کی تشکیل کے بعد کثیر تعداد میں لوگ دوسرے مقامات سے منتقل ہو کر یہاں آ بسے۔ اوّل الذکر زمرہ کے لوگ ہوں یا ثانی الذکر گروہ کے، ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مملکت کو اپنا نشیمن بنایا ان کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی تھی (اور بجا طور پر کی جانی چاہیئے تھی) کہ وہ اس مملکت کی اساس و بنیاد سے متفق ہیں اور اس کے محافظ اور امین۔ لیکن بعد میں رونما ہونے والے حالات نے اِس حسنِ ظن اور نیک توقع کی تردید کر دی اور دیکھا یہ گیا کہ یہاں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو نہ صرف اس کی اساس پر یقین نہیں رکھتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ وسادس انگیزیوں سے اس کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ ایمان کے اشتراک کی بنا پر مسلمانوں کی الگ

قومیت کے نظریہ کے خلاف (جسے مختصر الفاظ میں "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے) یہاں جو لب کشائی بھی ہوگی وہ ان کی اسی سعیٔ نامراد کی غماز ہوگی۔

میں تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اس قسم کے اعتراضات کا جواب دیتا رہا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی۔ اس لئے کہ "دو قومی نظریہ" میرا سیاسی مقصد ہی نہیں میرے ایمان کا جزو ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر میرا مبسوط اور قرآنی اسناد سے بھرپور مقالہ (طلوعِ اسلام - بابت جنوری ۱۹۸۱ء اور نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۱ر نومبر ۱۹۸۰ء) میں شائع ہوا تھا جسے ملک کے اربابِ دانش و بینش نے بنظرِ تحسین دیکھا۔ وہ مقالہ ایسا مبسوط اور مدلّل تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے بعد اس نظریہ کے خلاف کوئی کچھ نہیں لکھے گا۔ لیکن مخالفت کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ "دو قومی نظریہ اور اسلامی نظریہ کی جامعیت" کے عنوان سے محترم فتح نصیب چوہدری کے قلم سے ایک طویل مقالہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۲ار اور ۱۳ر اپریل میں دو قسطوں میں شائع ہوا اور آخر میں "جاری ہے" لکھا ہے۔ یہ مقالہ کچھ ایسا بیش افادہ یا اور صاحبِ مقالہ کی قرآن کریم کی تعلیم سے ناواقفیت کا آئینہ دار ہے کہ میں اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتا۔ لیکن مقالہ نگار کے نام کے ساتھ "شعبہ سیاسیات پنجاب یونیورسٹی" کا لاحقہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صاحب کے خیالات ان کی ذات تک محدود نہیں۔ اُستاد ہونے کی جہت سے اِس سے ان کے طلباء کے (ناپختہ) ذہنوں کے متاثر ہو جانے کا بھی خدشہ ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں اصل حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ خود مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے خلاف اعتراضات کی جوابدہی شاید میری زندگی کا مقدر بن چکی ہے۔ ٹھیک ہے ؏

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

———— (۰) ————

مقالہ نگار آغازِ کلام اس طرح کرتے ہیں:-

برّصغیرِ ہند کی تقسیم جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا، کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کے مشہور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر عمل میں آئی تھی۔ لیکن یہ دو قومی نظریہ کیا تھا۔ اِس کی نظریاتی اور عملی بنیادیں کیا تھیں۔ قائدِ اعظمؒ نے کن اصولی دلائل کے حوالے سے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا تھا۔ برّصغیر کی بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے ان سب سوالات کے جوابات کا ہم میں سے بیشتر کو صحیح طور پر علم نہیں۔ اس سلسلہ میں ہم عام طور پر اور ہمارے لکھنے والے خاص طور پر جو مؤقف اختیار کرتے ہیں اُسے اگر مختصراً بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار چونکہ نسلی اور وطنی رشتے نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات ہے۔ اس لئے مسلمانانِ برّصغیر یہاں کے ہندوؤں اور دوسرے باشندوں سے جداگانہ نظریۂ حیات کے پیروکار ہونے کے ناتے ایک الگ قوم قرار پاتے ہیں۔ لیکن یہ مؤقف علمی

اور عملی حقائق کے حوالے سے اتنا کمزور اور غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس سے ہم ان تمام اعتراضات کا جواب نہیں دے سکتے جو وقتاً فوقتاً اٹھائے جاتے رہے ہیں یا اٹھائے جا رہے ہیں۔

آگے چل کر دو ٹوک الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام، قومیت کا معیار نسل یا وطن کو نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات کو قرار دیتا ہے۔ قرآن کی رُو سے غلط ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ہم مسلمان اسلامی نظریۂ حیات میں اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم نہیں۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ کی باری آتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

قائدِ اعظمؒ نے یہ تاریخی معرکہ دو قومی نظریہ کو اُس انداز سے پیش کر کے نہیں جیتا تھا جس انداز میں ہم آج اسے پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمارا قومیت کا معیار صرف اور صرف مذہب ہے، اس لئے ہم مسلمان برِصغیر کے دوسرے باشندوں سے الگ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ بلکہ انہوں نے برِصغیر کے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کا نظریہ ان تمام حقائق و عوامل کی بنا پر پیش کیا تھا جو قومیت کے حقیقی معیار پر پورے اُترتے ہیں اور جنہیں قومیت کی تشکیل کے ضمن میں علمی اور عملی سطح پر بھی مسلّمہ سمجھا جاتا ہے۔

مذہب کو بنیادِ قومیت قرار دینے کے خلاف جو اعتراضات اُبھرتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ مسٹر گاندھی نے ۱۹۳۹ء میں یہ اعتراض کیا تھا کہ

ممکن ہے یہ دعویٰ کہ ہند میں مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں قابلِ بحث ہو لیکن یہ تو میں نے کبھی نہیں سنا کہ دنیا میں اتنی ہی قومیں ہیں جتنے کہ مذاہب۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ "انگریز"، "مصری"، "امریکی"، "جاپانی" وغیرہ تو جُداگانہ قومیں نہیں لیکن مسلمان، ہندو، پارسی، عیسائی، یہودی وغیرہ جداگانہ قومیں ہیں۔ خواہ وہ کہیں پیدا ہوئے ہوں۔

یہ مسٹر گاندھی کا اعتراض تھا اس پر ہمارے یہ معلّم سیاسیات اضافہ فرماتے ہیں کہ

اس سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ محض مذہب یا نظریۂ حیات کو ہی اگر قومیت کا معیار مان لیا جائے تو یورپ امریکہ اور افریقہ کی ان بہت سی اقوام کا کیا جواز بنتا ہے جو کہ ایک ہی مذہب یا نظریۂ حیات یعنی عیسائیت کی علمبردار ہیں۔ اسی طرح "ایرانی"، "مصری"، "شامی"، "عراقی"، "فلسطینی" اور "انڈونیشی" اقوام کا کیا جواز مہیا کیا جائے گا جبکہ وہ ایک ہی نظریۂ حیات یعنی اسلام کے پیروکار ہیں ..... سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر برِصغیر کے مسلمان محض اسلامی نظریۂ حیات کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم قرار پاتے ہیں تو پھر ایران، افغانستان اور دیگر ممالک کے مسلمانوں سے ان کی جداگانہ قومیت کا کیا جواز ہے۔

یہاں تک مقالہ نگار نے یہ کہا ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے قومیت کی بنیاد مذہب کا

اشتراک ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ پھر قومیت کا معیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قوم صرف اور محض نظریاتی اشتراک یا مذہبی اتحاد کی بنا پر وجود میں آنے والی انسانی جمعیت کا نام نہیں بلکہ انسانوں کے ایک ایسے اجتماع کا نام ہے جو ثقافتی اتحاد کی تمام معروف قدروں کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

اسلام میں بھی قومیت کا معیار نظریۂ حیات نہیں بلکہ نسلی اور ثقافتی یکسانیت ہی ہے۔ اور قرآن کی رُو سے قوم ایسے ہی گروہ کو کہا جائے گا جو نظریۂ حیات کی بنا پر نہیں بلکہ ثقافتی یکسانیت کی بنا پر وجود میں آیا ہو۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام قومیت کا معیار نسل یا وطن کو نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات کو قرار دیتا ہے قرآن کی رُو سے غلط ٹھہرتا ہے۔

اور مقطع کے بند میں بالکل کھل کر سامنے آجاتے ہیں، جب کہتے ہیں:۔

نسلی یکسانیت، لسانی وحدت، مذہبی اشتراک اور جغرافیائی وحدت سب کی سب اگرچہ کسی گروہ میں مشترک ثقافتی ورثہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر ان میں قومیت کے اعتبار سے جغرافیائی وحدت سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اور اُن کی آخری دلیل یہ ہے کہ

ہمارے علمی حلقوں میں جو یہ تصوّر پایا جاتا ہے کہ اسلام کے پیروکار ہونے کے ناتے ہم مسلمان ایک قوم ہیں یا یہ کہ اسلام کا قومیت کا معیار نسل یا ثقافتی رشتے نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہم قوم اور ملّت یا اُمّت کی اصطلاحوں کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ دونوں اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ (اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اشتراکِ مذہب کی بنا پر مسلمان ایک اُمّت قرار پائیں گے۔ ایک قوم نہیں۔ قرآن نے انہیں قوم نہیں، اُمّت ہی کہا ہے۔ اس لئے) "مسلمان کو ایک قوم نہیں، مسلمان کو ایک اُمّت یا اُمّتِ اسلامیہ کہا جائے گا۔ جہاں تک ان کی قومیت کا تعلق ہے تو وہ اُسی نسل یا ثقافتی ورثہ کے حوالے سے متعیّن ہوگی جس سے اُن کا نسلی یا ثقافتی تعلق ہوگا۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ چودھری فتح نصیب صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ

(۱) اسلام میں تقسیمِ انسانیت کی بنیاد مذہب نہیں۔

(۲) قائدِ اعظمؒ نے بھی مسٹر گاندھی اور دیگر نیشنلسٹ لیڈروں کے اعتراضات کے جواب میں) صرف مذہب کو وجہِ جامعیت قرار نہیں دیا تھا۔

(۳) اگر مذہب کو بناءِ قومیت قرار دے دیا جائے تو دنیا کی سینکڑوں قوموں کے متعلق کیا کہا جائیگا۔

(۴) تشکیلِ قومیت کی بنیاد ثقافتی، نسلی یا جغرافیائی وحدت ہے۔

(۵) قرآن میں مسلمانوں کے لئے اُمّت، کا لفظ آیا ہے، قوم کا نہیں۔

آیئے ان دعاوی کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ یہ کس قدر مغالطہ آفرینی پر مبنی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ اعتراضات نئے نہیں۔ یہ سب، تحریکِ پاکستان کے دوران مخالفین کی طرف سے اٹھائے جاتے تھے۔ اور طلوعِ اسلام میں ان کا تفصیلی جواب ساتھ کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ (تفصیل کے لئے میں قارئین کی توجہ اپنے اس مقالہ کی طرف مبذول کراؤں گا جو "دو قومی نظریہ" کے عنوان سے نوائے وقت کی ۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) اب یہ دیکھئے کہ اسلام کی رُو سے صحیح پوزیشن کیا ہے۔

(۰)

(۱) قرآنِ کریم کی رُو سے بناءِ تقسیم

قرآنِ کریم میں ہے:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ..... (۶۴/۲)

خدا نے تمہیں (تمام انسانوں کو) پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا۔

سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں میں جو تفریق و تقسیم کی ہے اس کی بنیاد خالص مذہب (کفر و ایمان) ہے یا اس کے ساتھ، یا اس سے الگ، کوئی اور عنصر بھی؟ قرآن نے وجہِ تقسیم صرف اور صرف کفر و ایمان کو قرار دیا ہے۔

کفر و ایمان کی بنا پر دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو جانے والے انسانوں کے باہمی تعلقات کو قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ حیات میں (جسے اُس نے اسوۂ حسنہ۔ بہترین نمونہ قرار دیا ہے) تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انہوں نے (ایمان میں مشترک نہ ہونے والے) اپنے باپ اور پوری کی پوری قوم سے برملا کہہ دیا کہ

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ..... (۱۹/۴۸)

میں تم سے جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ:۔

إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ

ہم تم سے اور اُن سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو، ان سب سے بے تعلق ہیں۔

كَفَرْنَا بِكُمْ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں" وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا ..... "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی" اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت

سے" اور یہ نفرت، رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر ایمان لے آؤ جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے، حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ ... (۶۰/۴)" اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶) "جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے۔" اور میرے اپنے "جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہوں" وہ میرے غیر" ہیں۔

غور کیجئے، حضرت ابراہیمؑ کی یہ قوم نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، ہر لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مشترک تھی۔ ان اشتراکات کے باوجود وہ کونسا عنصر تھا جس نے اُن میں ایسی گہری تفریق پیدا کر دی - ایمان (مذہب) اور صرف ایمان۔ چنانچہ انہوں نے اُن سے واضح طور پر کہہ دیا کہ تم اور ہم اُسی صورت میں ایک ہو سکتے ہیں جب تم ایمان میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ رسالت میں کفر اور ایمان کی تفریق کی بنا پر جو دو گروہ وجود میں آئے وہ بھی نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، حتیٰ کہ رشتہ داری کی بنا پر مشترک تھے۔ اس تفریق کے بعد ان دونوں گروہوں کے متعلق واضح الفاظ میں فرمادیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ... (۹/۷۱) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔" اور اُن کے مقابلہ میں، نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم: بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ... (۸/۷۳) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز" اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ ....

اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔

اس لئے کہ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ..... یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ...... ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ ...... ان کی بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ اُن کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥ (۳/۱۱۸) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)۔

آپ نے غور فرمایا کہ اختلافِ مذہب (کفر و ایمان) کی بنا پر جو تفریق واضح ہوتی ہے اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ ایمان کے اشتراک کی بنا پر یک جا ہونے والے افراد کو وہ صرف ایک گروہ کے افراد نہیں کہتا۔ وہ انہیں ایک دوسرے کے بھائی کہہ کر پکارتا ہے۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ... (۳/۱۰۳)" اس نے تمہیں اپنی نوازش کریمانہ سے باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔" یعنی جو لوگ نسلی، ثقافتی، لسانی وطنی اعتبار سے ایک تھے وہ ایمان کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن قرار پاگئے اور جو ان تمام

اعتبارات میں ایک دوسرے سے الگ تھے وہ محض ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ابوجہل اور عمرؓ نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، ہر لحاظ سے ایک تھے۔ لیکن جب عمرؓ ایمان لے آئے تو اُن کے باہمی تمام رشتے منقطع ہو گئے۔ اور بلالؓ، عمرؓ کا بھائی بن گیا جو ان تمام اعتبارات کی رو سے عمرؓ سے مختلف تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلام میں وجہِ جامعیت مذہب (ایمان) اور صرف مذہب ہے۔ نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، خون، رنگ کا کوئی اشتراک نہیں۔ وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ....

(۰)

(۲) قائدِ اعظمؒ اور بناءِ قومیت

قائدِ اعظمؒ نے اِس حقیقت کو چند الفاظ میں اِس جامعیت سے بیان کر دیا کہ جوں جوں انسان اُن پر غور کرتا ہے اس کی فکر و جد میں آجاتی ہے۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو، علی گڑھ یونیورسٹی میں، ایک تقریر کے دوران کہا تھا:۔

پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ جب اُس غیر مسلم نے اسلام اختیار کیا تھا تو اُس نے اپنے نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی رشتوں کو نہیں بدلا تھا۔ وہ تو بدستور موجود تھے۔ اُس نے صرف مذہب کو بدلا تھا۔ اور اس تبدیلی (اور صرف اس تبدیلی) کی بنا پر وہ پاکستان کی پہلی اینٹ قرار پا گیا تھا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے مسلم قومیت کی بنا کس چیز کو قرار دیا تھا! صرف مذہب کو!

مسٹر گاندھی نے (خود فریبی یا ابلہ فریبی) کی بنا پر اعتراض کیا تھا کہ

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی نے کہا تھا کہ جن لوگوں نے مذہب تبدیل کیا تھا اُن کے نسلی، ثقافتی، وطنی ناتے تو بدستور غیر مسلموں کے ساتھ پیوست تھے۔ تبدیلی محض مذہب کی تھی، تو مذہب کو تشکیلِ قومیت سے کیا واسطہ کہ محض اس کی تبدیلی سے اُن کی قومیت تبدیل ہو گئی! سنیئے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس سلسلہ میں مسٹر گاندھی سے کیا کہا تھا۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا:۔

> آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن آپ سے جب سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ

ہے جو انہیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ آج انسانی سعی دکاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات سے واسطہ نہ ہو میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ (جناح کا خط بنام گاندھی۔ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء)

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے مسٹر گاندھی کے اس اعتراض کا جواب ہی نہیں دیا۔ (کہ مذہب تشکیل قومیت کی بنا نہیں ہو سکتا) بلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اسلام کی رُو سے تمام امورِ حیات کی بنا مذہب ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مقالہ —— کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ —— (مطبوعہ طلوع اسلام۔ دسمبر سنہ ۱۹۸۰ء و نوائے وقت مورخہ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء)۔ اس سے یہ فطری نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا مذہب دوسروں سے مختلف ہوگا تو ان کی ثقافت، تمدن، معاشرت، سیاست سب دوسروں سے مختلف اور منفرد ہوں گے کیونکہ اُن کے مذہب کی اصل کی شاخیں ہوں گی۔ اسی بنا پر قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمدن و ثقافت وغیرہ بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں تھی کہ ان کی قومیت کی بنیاد، مذہب کو چھوڑ کر ان کا تمدن یا ثقافت تھی۔ انہوں نے اس خط میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مذہب نہ رہے تو وہ زندگی انسانی نہیں، محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ خیزی رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(۳) دوسری قوموں کا غم!

پروفیسر صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ اگر اسلام کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ قومیت کی بناءِ اشتراکِ ایمان ہے تو دنیا کی ان قوموں کا کیا بنے گا جو ایک مذہب (عیسائیت) رکھنے کے باوجود دیگر عناصر (نسل وطن وغیرہ) کی بنا پر اپنا مختلف قومی تشخص رکھتی ہیں۔ یقین مانیے! ایک پڑھے لکھے شخص کی طرف سے اس قدر عامیانہ اعتراض دیکھ کر ہمیں بڑا افسوس ہوا۔

اسلام ہر شعبۂ حیات کے متعلق اپنے مخصوص اور منفرد اصول رکھتا ہے۔ اگر ہم ان اصولوں کو اپنا نظامِ حیات قرار دیتے ہیں تو ان کا اطلاق ان اصولوں کو ماننے والے (مسلمانوں) پر ہوگا۔ غیروں کو اختیار ہوگا کہ وہ جی چاہے تو ان اصولوں کو اپنے ہاں رائج کر لیں، اور جی چاہے تو اپنے مروّجہ اصولوں پر کاربند رہیں۔ اگر وہ نسلی یا وطنی اشتراک کو بناءِ قومیت قرار دیتے ہیں تو دیتے رہیں۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے ہاں اسے بناءِ قومیت قرار نہیں دیں گے۔ ہماری قومیت کی تشکیل اشتراکِ مذہب کی بنا پر ہی ہوگی۔

(ضمناً) پروفیسر صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب تو اقوامِ مغرب کے دانشور بھی اپنے ہاں کی بناءِ قومیت کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں اور کسی متبادل بناءِ قومیت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہم

انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ نیشنلزم کے موضوع پر دانشورانِ مغرب کے حالیہ خیالات کا مطالعہ فرمائیں۔ وہ تو اپنے ہاں کی قومیتوں سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں اور ہمارے مقالہ نگار اس غم میں نڈھال ہو رہے ہیں کہ اگر ہم نے مذہب کو بناءِ قومیت تسلیم کر لیا تو اقوامِ مغرب کا کیا بنے گا؟

اب آئیے مسلمان قوموں کی طرف۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے ایمان کا اشتراک بناءِ قومیت ہے یا نہیں۔ اگر یہ بناءِ قومیت ہے تو کسی اور عنصر (وطن، نسل، زبان، رنگ) کو بناءِ قومیت قرار دینا خلافِ اسلام ہے۔ اگر مسلمان نام رکھنے والی قومیں ایسا کرتی ہیں تو ان کا یہ عمل اسلام کے خلاف ہوگا۔ لیکن پروفیسر صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ اگر یہ اصول (کہ مذہب بناءِ قومیت ہے) صحیح بھی ہے تو بھی ہمیں اسے اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے موجودہ مسلمان قوموں کا تشخص باقی نہیں رہے گا۔ گویا ہمیں ایک اسلامی اصول کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے غیر اسلامی اصولوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ کیسی دلچسپ ہے یہ منطق!

اسلام کا منتہیٰ، وحدتِ انسانیت ہے۔ اس کے لئے وہ بطورِ قدمِ اوّل ایسی قوم تیار کرتا ہے جو نسل، رنگ، زبان، وطن کی حدود سے بلند ہو کر خالص ایمان کے اشتراک سے وجود میں آئے۔ اس نے ایسی ہی امّت تیار کی تھی۔ صدرِ اوّل کے مسلمانوں میں صرف امّتِ مسلمہ کا وجود تھا۔ مصری، شامی، عراقی، حجازی، مسلمان قوموں کا وجود نہیں تھا۔ ان قومیتوں کا وجود اُس زمانے میں عمل میں آیا جب ہماری گاڑی اسلام کی پٹڑی سے الگ ہو گئی۔ جب اسلام دوبارہ نافذ العمل ہوگا تو یہ جاہلیہ کے تشخصات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ علامہ اقبالؒ (جنہوں نے اس بناءِ قومیت کا تصوّر دیا تھا) کے پیشِ نظر یہی تھا۔ انہوں نے سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء میں کہا تھا ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی (بانگِ درا)

اور ؎

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا (〃)
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا (〃)

نیز ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر (〃)
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر! (〃)
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدّم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر (〃)

اور زندگی کے آخری دَور میں ؎

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک — ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے (بالِ جبریل)

وحدتِ امّت کے اسی قرآنی تصوّر کو پیکر عطا کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر دیا تھا جس میں اب ہماری نئی نسل کی ذہنیتوں کے معمار (اساتذہ) انہیں یہ سبق پڑھا رہے ہیں کہ اگر اس نظریہ کو اپنایا گیا تو

افغانی، تورانی، خراسانی کا کیا بنے گا؟ اِس لئے خیر اسی میں ہے کہ اس قوم پر غیر اسلامی نظریات مسلط رہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر کلاس میں کبھی علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا اشعار سامنے ہوں گے تو فتح نصیب صاحب اپنے شاگردوں سے کہتے ہوں گے کہ اقبالؒ مسلمانوں کو غلط سبق پڑھا گئے ہیں؟

(۰)

(۴) ثقافتی ورثہ

تحریکِ پاکستان کے دوران مخالفین کی طرف سے "اشتراکِ وطن ہی کو وجہِ جامعیت قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن پاکستان میں آکر جغرافیائی اشتراک کے علاوہ، ایک اور تصور "ثقافتی ورثہ" کا بھی وجود پذیر ہو گیا۔ اگرچہ ثقافت کے متعلق آج تک کسی نے نہیں بتایا کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے؛ یہ ایک بڑی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ اس کے پیچھے دو جذبات کارفرما ہیں۔ مسٹر گاندھی نے یہ کہا تھا کہ اگر کچھ ہندو تبدیلیٔ مذہب سے مسلمان ہو جاتے ہیں تو وہ صرف اپنا مذہب بدلتے ہیں۔ وہ ثقافت (کلچر) جو اُن میں وراثتاً چلا آ رہا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس ورثہ کی بنا پر وہ اپنی سابقہ قومیت کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہ سازش ابھی تک رینگتی، سنگتی، پاکستان کی طرف آتی رہی ہے۔ غیر ملکی سیاح پہلے ہندوستان جاتے ہیں اور وہاں سے پاکستان آتے ہیں۔ وہ دونوں ملکوں میں موسیقی، رقص، ڈرامے، وغیرہ دیکھنے کے بعد یہ تاثر دے جاتے ہیں کہ اس ثقافتی ورثہ میں ہم نے ان دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ اس لئے یہاں کا مسلمان اور وہاں کا ہندو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ ان میں بُعد صرف سیاسی مفادات کا پیدا کردہ ہے۔

کچھ قوموں کو خطرہ لاحق ہوا کہ پاکستان اگر اسلام کے نام پر نہ سہی وطن کی بنا پر بھی ایک ملک اور ایک قوم کی حیثیت سے قائم رہ گیا تو ان کے لئے وجہِ دردِ سر رہے گا۔ اس کے ازالہ کے لئے کچھ عرصہ ہوا روس سے ایک مؤرخ تشریف لائے جنہوں نے (NATIONALITIES IN PAKISTAN) کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں انہوں نے اس نظریہ کو اُجاگر کیا تھا کہ قومیت کی بنا ثقافت ہوتی ہے۔ اور پاکستان کے مختلف صوبوں کی ثقافت الگ الگ ہے۔ اس لئے یہاں ایک (پاکستانی) قوم نہیں بستی۔ چار (صوبوں کی) مختلف قومیں آباد ہیں۔ اس نظریہ کو فیضؔ اور جوشؔ جیسے قلمکاروں نے ہی نہیں مسٹر بزنجو اور مینگلؔ جیسے سیاستدانوں نے بھی خوب اچھالا تھا۔ اب چودھری فتح نصیب صاحب بھی فرما رہے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں ثقافتی ورثہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ؎

خدا دندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ (بالِ جبریل)

(۵) قوم نہیں اُمّت!

مقالہ نگار کا اگلا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو اُمّت قرار دیا ہے، قوم نہیں۔ اِس لئے وہ

مذہب کے اشتراک سے ایک اُمّت تو بن سکتے ہیں۔ قوم نہیں بن سکتے۔

اس سے ہمیں وہ معرکہ یاد آگیا جو تحریکِ پاکستان کے دوران (مولانا) حسین احمد (مدنی) اور علامہ اقبالؒ میں برپا ہوا تھا۔ مولانا مرحوم نے اپنی تقریر میں کہا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس پر علامہ مرحوم تڑپ اُٹھے اور انہوں نے اپنے بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے یہ اشعار فضا میں پھیلا دیئے کہ ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ! ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است (ارمغانِ حجاز)

سرود برسرِ منبر کہ ملّت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است! (" ")

مولانا مرحوم نے اس کے جواب میں ایک لمبا چوڑا بیان شائع فرمایا جس میں سارا زور اس نکتہ پر صرف کیا گیا تھا کہ میں نے اپنی تقریر میں "قوم" کہا تھا "ملّت" نہیں کہا تھا۔ اقبالؒ نے میرے بیان میں تحریف کی ہے اور پھر ملّت اور قوم کے لغوی معانی پر وہ بحث شروع کر دی تھی جس کا نفسِ موضوع سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرتِ علامہ نے اپنے جواب میں کہا تھا کہ ؎

قلندر جزدو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا (بالِ جبریل)

اسی کی صدائے بازگشت فتح نصیب صاحب کے مقالہ میں سنائی دیتی ہے۔ جہاں وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کے لئے اُمّت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قوم کا نہیں۔ اور "اُمّت" اور "قوم" کے لغوی معانی میں بڑا فرق ہے۔

یہ صاحب سیاسیات کے اُستاد ہیں اس لئے ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے کہ جب کوئی لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اُس کے لغوی معنی نہیں لئے جاتے اصطلاحی مفہوم لیا جاتا ہے اور اُن میں اکثر بڑا فرق ہوتا ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ لفظ قوم یا نیشن نے جو سیاسی مفہوم آجکل اختیار کر رکھا ہے زمانہ نزولِ قرآن کے عرب معاشرہ میں اس کا تصوّر تک نہیں تھا۔ وہ لوگ اس لفظ (قوم) کو ان معنوں میں استعمال کرتے تھے جن معنوں میں ہم لفظ "لوگ" استعمال کرتے ہیں۔ (وہ تو بلکہ اس میں عورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے) قرآنِ کریم نے (مثلاً) جب قَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ... (۶/۱۴۷) کہا تو اس کے معنی وہ لوگ تھے جو جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔ اُس نے جب لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ... (۴۵/۵) کہا تو اس سے مراد وہ لوگ تھے جو عقل و فکر سے کام لیں۔ اس نے جب مختلف انبیاء کی اقوام کا ذکر کیا تو اس سے مراد وہ لوگ لئے جن کی طرف وہ انبیاء مبعوث ہوئے تھے یا جن میں وہ رہتے سہتے تھے۔ اِن آیات میں لفظِ قوم سے مراد آج کل کی سیاسی اصطلاح کی نیشن نہیں تھی۔

علامہ اقبالؒ کو ایک دفعہ اور بھی اسی قسم کے الجھاؤ سے واسطہ پڑا تھا۔ وطن پرست (نیشنلسٹ) طبقہ نے کہیں سے عربی کا ایک فقرہ ـــ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِيْمَانِ ـــ سن لیا اور اُسے حدیثِ نبویؐ کہہ کر یہ دعویٰ کر دیا کہ حب الوطنی (PATRIOTISM) ایمان کا جزو ہے۔ علامہ اقبالؒ نے یہ سنا تو کہا کہ اوّل تو یہ فقرہ حدیثِ نبویؐ ہے ہی نہیں اور اگر اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو

اس میں وطن سے مراد محض جائے سکونت ہے۔ وہ سیاسی مفہوم نہیں جو اس سے آجکل لیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے انہوں نے اپنی مشہور نظم (وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) میں کہا تھا کہ

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے (بانگِ درا)

گفتارِ سیاست میں "وطن" وہ ہے کہ ..... "جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے"

سوال یہ ہے کہ آج کل کی اصطلاح میں قومیت کی جو بنیاد ہے کیا وہ اسلام کے مطابق ہے۔ اور اس کا جواب دو ٹوک الفاظ میں "نفی" میں ہے۔ قرآن کی رُو سے قومیت کی بنیاد ایمان کا اشتراک ہے اور بس۔

اب رہا معترض کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو "اُمت" کہا ہے "قوم" نہیں کہا تو یہ اُن کی قرآن سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ قرآن میں جماعتِ مومنین کے لئے قوم کا لفظ بھی آیا ہے (مثلاً) سورۃ الاعراف میں ہے ..... هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷/۵۲) "ہدایت و رحمت اس قوم کے لئے جو ایمان لائی ہے"۔ اس کے برعکس اس نے کفار کے لئے (عن) قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰/۱۰۱) کہا ہے وہ قوم جو ایمان نہیں لائی۔ سورۃ مجادلہ میں ان دونوں گروہوں کا تقابل بڑے بلیغ انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲)

تو کبھی ایسا نہیں دیکھے گا کہ وہ قوم جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھے۔ وہ اُن لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کرے جو نظامِ خداوندی کے مخالف ہوں خواہ وہ ان کے ماں باپ بیٹے (بیٹیاں) بھائی بند یا اُن کے خاندان کے دیگر افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ افرادِ مومنین وہ لوگ ہیں کہ ایمان جن کے دل کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے اور خدا کی وحی کی قوت اُن کی تائید و نصرت کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ یہ اس جنتی معاشرہ میں داخل ہوں گے جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ اللہ اُن سے راضی ہو گیا وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

یہ ہے خدا کی پارٹی۔ یاد رکھو! آخر الامر کامیابی اور کامرانی خدا کی پارٹی ہی کو نصیب ہو گی۔

یہاں دیکھئے مومنین کو قوم کہا گیا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں سے تعلقات منقطع کر لئے جو اگرچہ نسلی، لسانی ثقافتی، خاندانی اعتبار سے ان میں شامل تھے لیکن چونکہ وہ ایمان میں ان سے الگ تھے اس لئے ان میں باہمی ایسے تعلقات نہیں تھے جو (آجکل کی اصطلاح میں) کسی قوم کے افراد میں ہوتے ہیں۔ اور سب سے

آخر یہ کہ انہیں حزب اللہ (خدا کی پارٹی) کہا گیا۔ ان کے برعکس ایمان نہ لانے والوں کو حزب الشیطان (۵۸/۲۲) انہی کو موجودہ اصطلاح میں مسلمانوں کی قوم اور غیر مسلموں کی قوم کہا جائے گا۔

اگر اُمّت اور قوم کے لفظی اختلاف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا مقصود ہے کہ اُمّت کا لفظ مذہبی امور سے ہے اور قوم کا سیاسی امور سے، تو یہ دین اور سیاست کی وہ ثنویت ہے جو اسلام کی جڑ بنیاد کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ قرآن کی رُو سے مملکت، ایمان اور اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ...... اور اس استخلاف (مملکت وحکومت) کا مقصد دین کا تمکّن ...... لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ (۲۴/۵۵)

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" اس مملکت کا فریضہ بنایا گیا ہے۔ (۲۲/۴۱) اور اس فریضہ کی ادائیگی، اُمّت کے سپرد کی گئی ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ...... (۳/۱۱۰)

ہم پوچھتے ہیں مقالہ نگار سے کہ موجودہ سیاست کی رُو سے .... قوم کا وجود اور کا ہے کے لئے ہوتا ہے؟ سو اگر قوم کا فریضہ وہی ہوتا ہے جسے قرآن نے اُمّت کا فریضہ قرار دیا ہے تو پھر اس سے فرق کیا پڑتا ہے کہ قرآن نے جماعتِ مومنین کے لئے اُمّت کا لفظ استعمال کیا ہے، قوم کا نہیں (اگرچہ اس نے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے)

قرآن نے اُمّت کے لفظ کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ لغت کی رُو سے بھی اس میں دین اور جماعت دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ یعنی دین کی بنیادوں پر متشکل اور دین کے مقاصد کو پورا کرنے والی جماعت کو اُمّت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا خود اس لفظ سے بھی ان تمام اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے جو مقالہ نگار نے اپنی سطح بینی کی بنا پر اُٹھائے ہیں۔

اس سے زیادہ ہم پروفیسر صاحب اور ان کے ہم نواؤں سے کیا کہیں گے کہ ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ۔۔۔ تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے! (ضربِ کلیم)

مغربی نظامِ تعلیم نے ہماری قوم کے ذہنوں میں کتنے بت خانے تعمیر کر رکھے ہیں؟

خریدار صاحبان متوجہ ہوں!

۱۔ بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

۲۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۲۲ مارچ تا ۱۹ مئی ۱۹۸۱ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۔ علی اختر صاحب۔ لندن	۲۲۲۵/-	۳۸۸۱/۱۲۲
۲۔ سلیم اختر صاحب۔ بذریعہ علی اختر۔ لندن	۲۲۲/۵۰	۳۸۸۲
۳۔ چودھری قربان علی صاحب " " " "	۸۹/-	۳۸۸۳
۴۔ احباب کویت معرفت محمد طور داز خانصاحب۔ کویت	۳۰۰/-	۳۸۸۴
۵۔ عبدالرحمان وڈیرا صاحب۔ معرفت بزم طلوع اسلام ٹورنٹو (کینیڈا)	$ ۲۵/- CANADIAN	۳۸۸۵
۶۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحب۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۸۸۶
۷۔ " زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۸۸۷
۸۔ " بیگم ممتاز قریشی صاحبہ۔ گلبرگ لاہور	۱۰۰۰/-	۳۸۸۸
۹۔ " مس فریدہ خان صاحبہ۔ پونچھ روڈ لاہور	۲۰۰/-	۳۸۸۹
۱۰۔ " مسز عباس جعفر صاحبہ ڈیلیٹن بیکس معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۰۷/۷۶	۳۸۹۰
۱۱۔ محمد اسماعیل اچھا صاحب۔ بولٹن " " " "	۴۳/۱۲	۳۸۹۱
۱۲۔ روشن عباسی صاحب " " " "	۵۶۰/۳۶	۳۸۹۲
۱۳۔ انور رومتہ صاحب۔ بذریعہ حبیب خان " " " "	۱۰۷/۷۶	۳۸۹۳
۱۴۔ محمد ارشاد صاحب۔ ٹیچر۔ چارہان مری	۲۵/-	۳۸۹۴
۱۵۔ محمد حلیم خانصاحب۔ معرفت بزم طلوع اسلام لاہور	۲۵/-	۳۸۹۵
۱۶۔ محمد سلیمان خانصاحب۔ ہری پور ہزارہ	۸۰۰/-	۳۸۹۶
۱۷۔ یم بار فلنگ سٹیشن منگورہ سوات	۳۸/-	۳۸۹۷
۱۸۔ محترمہ بیگم چودھری عبدالکریم صاحب۔ ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۸۹۸
۱۹۔ اعجاز احمد صاحب۔ کویت	۱۰۰۰/-	۳۸۹۹
۲۰۔ ملک حبیب وجدان صاحب۔ مری	۵۰/-	۳۹۰۰
۲۱۔ عبدالرشید مجتبیٰ صاحب (مورگاہ) راولپنڈی	۵۰/-	۳۹۰۱
۲۲۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۹۰۰/-	۳۹۰۲

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۲۳۔ غلام محمد اعوان صاحب۔ معرفت بزم طلوع اسلام پنج کسی	۱۰۰/-	۳۹۰۳
۲۴۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۹۰۴
۲۵۔ " بیگم چودھری عبدالکریم صاحب۔ ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۹۰۵
۲۶۔ قمر نقوی صاحب۔ معرفت بزم طلوع اسلام کراچی	۲۰۰۰/-	۳۹۰۶
۲۷۔ تحقق خان ناک صاحب " " " "	۳۰۰/-	۳۹۰۷
۲۸۔ یونس قریشی صاحب " " " "	۲۸۰/-	۳۹۰۸
۲۹۔ عبدالمجید باعلقم صاحب " " " "	۱۰۰/-	۳۹۰۹
۳۰۔ نور محمد رحمت اللہ صاحب " " " "	۱۵۰/-	۳۹۱۰
۳۱۔ نیاز بن خانصاحب " " " "	۱۰۰/-	۳۹۱۱
۳۲۔ امین اللہ رحمت اللہ صاحب " " " "	۱۰۰/-	۳۹۱۲
۳۳۔ محمد اکرم راٹھور صاحب " " " "	۲۵۰/-	۳۹۱۳
۳۴۔ احباب کویت معرفت محمد طور داز خانصاحب۔ کویت	۳۰۵۷/-	۳۹۱۴
۳۵۔ سردار محمد گلشن صاحب۔ رحیم یار خان	۵۰۰/-	۳۹۱۵
۳۶۔ حاجی محمد بخش ولد حاجی بقا محمد خان P.O رند جاوہ معرفت بزم طلوع اسلام پنج کسی	۳۰۰/-	۳۹۱۶
۳۷۔ DR MOTALA برمنگھم معرفت بزم طلوع اسلام "	۲۰۰/-	۳۹۱۷
۳۸۔ اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔	۱۲۰۰/-	۳۹۱۸
۳۹۔ محترمہ خورشیدہ نواز کھیری صاحبہ۔ برمنگھم	۲۵۱/۵۰	۳۹۱۹
۴۰۔ عبدالواحد رائیں صاحب گوٹھ اولیا آباد نواب شاہ سندھ	۱۰۰/-	۳۹۲۰

میزان ۲۰۰۳۲/-

سابقہ میزان ۶۸۱۸۶۶/۹۰

کل میزان ۷۰۱۸۹۶/۹۰

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزمہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :-	نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران میں مستفید کیسٹیں اور ٹیپس بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں
لاہور	جمعہ ۸ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰	
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱ بجے دوپہر	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	535 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT) M3N-2P8. PHONE (416) 661-2827	
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوعِ اسلام کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸	
پشاور (۱) (۲)	ہر جمعہ ۵ بجے شام ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIR MAINGATE) پشاور سٹیڈیم طلوعِ اسلام لائبریری۔ جہانگیر آباد۔ جمرود روڈ (پشاور یونیورسٹی)	ہاشم روڈ فون ۴۲۶۵۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ آفاقِ بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ	
لیّہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر میکینکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ (لیّہ)	
ایبٹ آباد	ہر اتوار ۴ بجے شام	دفتر غلام مصطفیٰ اعوان ایڈووکیٹ	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۲۔ نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پور، باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب	
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیاء ٹیوشن سنٹر، محلہ ہجویری مسجد۔ نزد تحصیل آفس، باہتمام محمد صفدر ملک صاحب	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۵ بجے شام	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ رسول لائنز	
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ پہلا اتوار دو بجے دوپہر (بمقام)	60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.	
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام۔ ۱/۱/۱۲ بی۔ مقبرہ روڈ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ	
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۳۱۰۴۱...)	
پنجکسی (تحصیل کبیر والا ملتان)	ہر جمعہ ۲ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)	
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۲)	
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/ب پیپلز کالونی ۱ (فون ۴۲۸۵۵)	